اُردُو کی پانچویں کتاب

پانچویں جماعت کے لیے

سرتاج بک ڈپو لمیٹڈ اُردُو بازار، لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور



اپیل

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، ایک قومی اِدارہ ہے۔ بچّوں کو معیاری اور سستی نصابی کُتب بروقت مہیا کرنا اِس اِدارے کے فرائض میں شامل ہے۔ اِس سال کتابوں کو معیاری اور جدید تر بنانے کے لیے خاص طور پر کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب سبزی مائل نیلاہٹ والے کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

بورڈ کی ہر نصابی کتاب کے سرورق پر بورڈ کا مخصوص نشان چھپا ہوتا ہے۔ جعل ساز جعلی نشان، گھٹیا کاغذ اور غیر معیاری سیاہی کے استعمال سے ناقص کُتب چھاپ کر مارکیٹ میں لے آتے ہیں۔ ان کُتب کا مواد بھی غلطیوں سے مبرّا نہیں ہوتا۔ اگر آپ کے ہاتھ کوئی جعلی کتاب لگ جائے تو براہِ کرم متعلقہ کُتب فروش کے نام اور پتے کے بارے میں بورڈ کو اطلاع دیں تاکہ جعلی کُتب کا گھناؤنا کاروبار کرنے والوں کے خلاف مؤثر کارروائی کی جا سکے۔

بورڈ کی مطبوعہ کُتب میں معیارِ طباعت اور جلد بندی درست رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے تاہم اگر آپ کے ہاتھ کوئی ایسی کتاب لگے جس میں طباعت یا جلد بندی کے نقائص ہوں تو متعلقہ کُتب فروش سے کتاب تبدیل کرنے کا مطالبہ کریں۔ بورڈ نے کُتب فروشوں کو ایسی ہدایات جاری کی ہوئی ہیں۔ شکایت کی صورت میں بورڈ کو اطلاع دیں۔

آپ کی اِطلاع کے لیے تحریر ہے کہ اس جماعت کے لیے بورڈ کی شائع شدہ حکومتِ پنجاب کی منظور کردہ کُتب مندرجہ ذیل ہیں:

1 — اُردو کی پانچویں کتاب

2 — دِینیات برائے جماعت پنجم

3 — مُعاشرتی عُلوم برائے جماعت پنجم

4 — اِبتدائی سائنس برائے جماعت پنجم

5 — ریاضی برائے جماعت پنجم

ان کُتب کے سوا آپ دیگر اضافی کُتب خریدنے کے پابند نہیں ہیں۔ اگر آپ کو مجبور کیا جائے تو مندرجہ ذیل پتے پر اِطلاع دیں۔

خواجہ غلام کبریا

چیئرمین

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ

21-ای 2- گلبرگ 3 - لاہور

اُردُو کی پانچویں کِتاب

پانچوِیں جماعت کے لیے



ناشر

سرتاج بک ڈپو لمیٹڈ اُردُو بازار، لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

تعداد	بار	اشاعت	تاریخ اشاعت
5000	چہارم	اوّل	مئی 1983

تیار کردہ : پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ منظور کردہ: حکومتِ پنجاب (محکمہ تعلیم)
لاہور بموجب سرکلر نمبر ایس۔او۔(سی)۔ 10-1/72 مورخہ 23-5-1974ء
نظرِ ثانی شدہ قومی ریویو کمیٹی، وفاقی وزارتِ تعلیم و صوبائی رابطہ حکومتِ پاکستان۔

مصنفین :-

ڈاکٹر اصغر علی شیخ
الطاف فاطمہ
ایم اسحاق جلالپوری
اختر الحسن بھٹی

ناشر : سرتاج بک ڈپو لمیٹڈ، اردو بازار۔ لاہور

طابع : سرتاج پرنٹنگ کارپوریشن ، لاہور

خطاطی :۔ انور حسین باجوہ شام نگر لاہور　　آرٹسٹ :۔ فوزیہ حیات ملک

فہرست

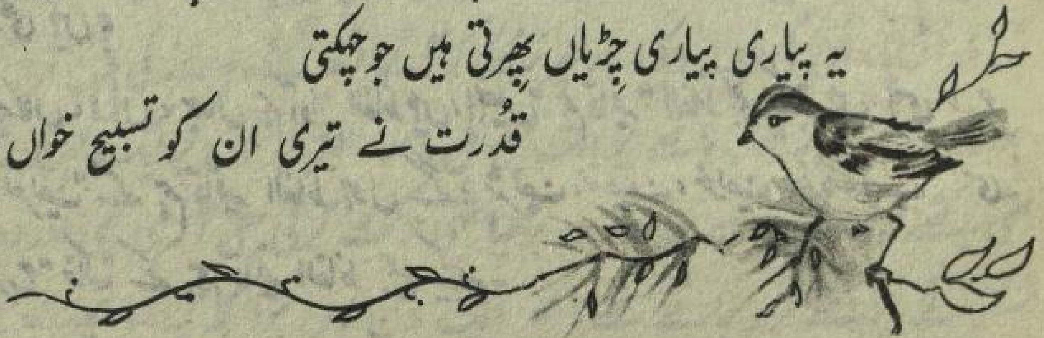
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

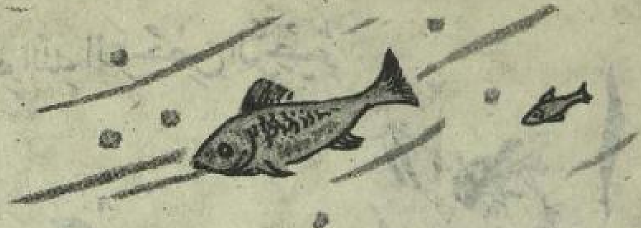


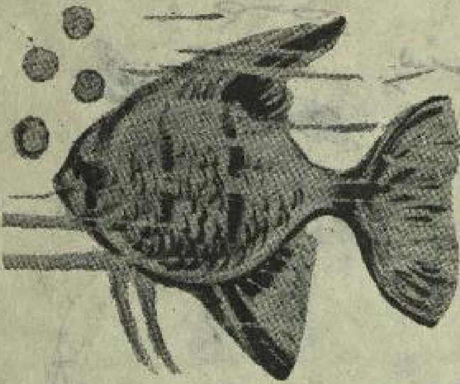


حمد

تعریف اُس خُدا کی جِس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی ، کیا آسماں بنایا
پَیروں تلے بِچھایا کیا خُوب فرشِ خاکی
اور سَر پہ لاجُوردی اِک سائباں بنایا
مٹی سے بیل بُوٹے کیا خُوش نُما اُگائے
پہنا کے سبز خِلعت ان کو جواں بنایا
خُوش رنگ اور خُوش بُو گُل پھول ہیں اُگائے
اِس خاک کے کھنڈر کو کیا گُلِستاں بنایا
میوے لگائے کیا کیا خُوش ذائقہ رسِیلے
چکھنے سے جن کے ہم کو شیریں دہاں بنایا
سُورَج بنا کے تُو نے رونق جہاں کو بخشی
رہنے کو یہ ہمارے اچھّا مکاں بنایا
یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی
قُدرت نے تیری ان کو تسبیح خواں بنایا







آبِ رواں کے اندر مچھلی بنائی تُو نے
مچھلی کے تیرنے کو آبِ رواں بنایا
ہر چیز سے ہے تیری کاری گری ٹپکتی
یہ کارخانہ تُو نے کب رائگاں بنایا

(اسمٰعیل میرٹھی)

مشق

1- اِن الفاظ کو تہجّی ترتیب سے لِکھ کر ان کے معنی درج کیجیے:-
لاجوَردی۔ کھنڈر۔ شِیریں دہاں۔ تسبیح خواں۔ آبِ رواں۔ رائگاں۔

2- اپنے جُملوں میں اِستعمال کیجیے:-
خُوشِ ذائقہ۔ رونق بخشنا۔ خلعت پہنانا۔ رائگاں۔

3- ایک چھوٹا سا مضمون لِکھ کر بتائیے کہ اللہ نے ہمیں کون کون سی نعمتیں دے رکھی ہیں؟

4- مکاں، دہاں، جہاں ہم آواز الفاظ ہیں، انھیں "ہم قافیہ" الفاظ بھی کہتے ہیں۔ اِسی طرح "تعریف" کے ہم قافیہ الفاظ ہوں گے: شریف، ضعیف، خریف وغیرہ۔ آپ اسی طرح "خاک" کے ہم قافیہ الفاظ جمع کیجیے۔

رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم

شہرِ مکّہ کی ایک گلی کے نُکڑ پر ایک بُوڑھی عورت اپنے گھر کی چھت پر کھڑی تھی۔ ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ اس کو کسی کا بے چینی سے انتظار ہے۔ وہ بار بار اس راستے کی طرف دیکھتی جو سردارِ قریش کے گھر سے باہر کی طرف جاتا تھا۔ وُہ کبھی راستے کی طرف دیکھتی اور کبھی اس ٹوکری کی طرف جو اس کے قریب ہی رکھّی تھی۔

بُڑھیا کو معلُوم تھا کہ جن کا اسے بے چینی سے انتظار ہے، اپنے مقررہ وقت پر اِدھر سے ضرُور گزُریں گے۔ اس کے باوجُود ایک وہم اُسے بے چین کیے ہُوئے تھا کہ ایسا نہ ہو، آج وُہ اپنا راستہ بدل لیں اور کسی دُوسرے راستے سے باہر نکل جائیں۔ اِتنے میں قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اُسے محسوس ہُوا کہ وُہ جن کا اِنتظار کر رہی ہے، اب اس کے گھر کے قریب ہی پہنچنے والے ہیں۔ اپنی ٹوکری کو اس نے مضبُوطی سے پکڑ لیا اور جُھک کر گلی کی طرف دیکھا۔ اس کی نظر ایک خوُب صورت چہرے، روشن پیشانی اور صاف ستھرے لباس والی شخصیّت پر پڑی جو نہایت متانت اور وقار سے چلتے ہُوئے قریب آرہی تھی۔ بُڑھیا دِل ہی دِل میں مُسکرائی "ہاں یہ وہی تو ہے، اسے کون نہیں پہچانتا۔" قدموں کی چاپ بہت قریب آگئی تھی۔ وہ اس کی چھت کے نیچے پہنچ گئے تھے۔ بُڑھیا نے ٹوکری اُٹھائی اور دُوسرے ہی لمحے کُوڑے کرکٹ سے بھری ٹوکری اُن پر اُلٹ دی۔ اُنھوں نے اپنا جُھکا ہُوا سَر اُٹھایا، اُوپر کی طرف دیکھا اور پھر سَر جُھکا کر آگے بڑھ گئے۔ ہر روز کی طرح آج بھی اُن کے چہرے پر خفگی تھی نہ غصّہ۔ ماتھے پر ایک بھی بَل نہ تھا۔ البتہ ہونٹوں پر ایک مہربان مُسکراہٹ تھی۔ کتنے ہی دنوں سے ہر روز وہ بُڑھیا یہی حرکت کرتی چلی آرہی تھی اور وہ اِسی طرح مُسکراتے ہُوئے گزُر جاتے تھے۔ پھر ایک دن یوں ہُوا کہ بُڑھیا چھت پر موجُود نہ

تھی۔ اس دن کسی نے اُن پر کوڑا نہ پھینکا۔ "آج ضرور کوئی بات ہے" گزرنے والے نے سوچا۔ اُدھر بڑھیا بخار اور تکلیف سے بے چین کروٹیں بدل رہی تھی۔ اِتنا بھی تو نہ تھا کہ کوئی اس کو ایک گھونٹ پانی ہی پلا دیتا۔ اِتنے میں دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"کون؟" بڑھیا نے کراہتے ہوئے پوچھا:

"محمدؐ!" جواب آیا "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

آواز میں اِتنی نرمی اور شفقت تھی کہ بلا ارادہ ہی اس کی زبان سے نکل گیا۔

"آجائیے!"

بڑھیا کو ایک دم خیال آیا۔

"محمدؐ!" اور وہ لرز گئی۔ یہی تو وہ شخص تھے، جن پر وہ ہر روز بلاناغہ کوڑا ڈالا کرتی تھی اور اب دیکھیں وہ کس طرح اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ خدا کے پیارے رسولؐ اور سردارِ قریش کے گھرانے کے معزز شخص جن کو دُشمن بھی صادق اور امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اس کے قریب کھڑے نرمی سے کہ رہے تھے۔ "آج آپ چھت پر موجود نہ تھیں، مجھے خیال ہُوا کہ ضرور بیمار ہیں۔ آپ بیمار اور تنہا ہیں۔ بتائیں میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"ایک پیالہ پانی پلا دیں۔" نرم زبان کی مٹھاس سے بڑھیا کا سارا خوف دُور ہو گیا۔ پھر جب تک وہ بیمار رہی، سچے اور پیارے نبی محمدؐ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم ہر روز اس کی عیادت کو تشریف لے جاتے، اس کا گھر صاف کرتے اور دوا لاکر دیتے تھے۔

آپؐ کے اچھے برتاؤ کا یہ اثر ہُوا کہ وہ بڑھیا آپؐ پر ایمان لے آئی۔ وہ آپؐ سے بدسلوکی صِرف اِس لیے کیا کرتی تھی کہ آپؐ لوگوں کو بتوں کی پرستش کے بجائے ایک خُدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے۔

بڑھیا جس نبیؐ پر ایمان لائی تھی، وہ ہمارے نبی محمدؐ مُصطفٰی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم تھے۔

آپؐ کے اخلاق اور رحمدلی کا یہی ایک واقعہ نہیں۔ لوگ آپؐ کو رحمتِ عالمؐ کے لقب سے یاد ہی اس لیے کرتے ہیں کہ آپؐ نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں پر بھی رحم کرتے تھے۔

آپؐ کو بچّوں سے خاص اُنس تھا۔ آپؐ بچّوں سے بڑی نرمی اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایک مرتبہ عید کے دن آپؐ اپنے پیارے نواسوں حضرت امام حسینؓ اور امام حسنؓ کے ساتھ عید کی نماز کو جا رہے تھے۔ راستے میں ایک یتیم بچّے کو دیکھا۔ اس کے کپڑے پھٹے پُرانے تھے اور وُہ رو رہا تھا۔ آپؐ نے رُک کر اُس سے رونے کا سبب پُوچھا تو اُس نے بتایا کہ میرے والد فوت ہو چکے ہیں۔ آپؐ کی آنکھوں میں آنسُو آ گئے اور پُوچھا "کیا تم یہ پسند نہیں کرو گے کہ مُحمّد (صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم) تُمھارے باپ ہوں، عائشہؓ تُمھاری ماں اور فاطمہؓ تُمھاری بہن ہو؟" چنانچہ آپؐ اُس بچّے کو اپنے ساتھ لے آئے۔ اپنے نواسوں کے کپڑے اُسے پہنائے اور اچھّے اچھّے کھانے کھلائے۔

ایک بار حضورؐ نے بازار میں کسی گھر کی خادمہ کو روتے دیکھا۔ اُس کے رونے کا سبب پُوچھا تو اُس نے بتایا کہ میری مالکہ نے سودا لانے کے لیے جو پیسے دیے تھے، وُہ گُم ہو گئے ہیں۔ آپؐ نے اِتنی رقم اُسے دے دی کہ سودا خرید کر لے جائے اب وُہ واپس جاتے ہوئے ڈر رہی تھی کہ اس کی مالکہ ناراض ہو گی کہ اتنی دیر کیوں لگا دی۔ چنانچہ آپؐ اس کے ساتھ گھر تک گئے اور مالکہ کو اس کی مجبُوری بتا کر سفارش کی کہ اس پر ناراض نہ ہو۔

انسانوں کے عِلاوہ آپؐ جانوروں پر بھی رحم فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؐ سفر پر جا رہے تھے۔ ایک جگہ قیام فرمایا۔ وہاں ایک جھاڑی میں چڑیا نے گھونسلا بنا رکھّا تھا۔ ایک صحابی نے چڑیا کے بچّے نِکال لیے اور چڑیا غریب بے قرار ہو کر چیں چیں کرنے لگی۔ یہ دیکھ کر آپؐ بے چَین ہو گئے اور آپؐ نے بچّے واپس گھونسلے میں رکھوا دیے۔

ایک مرتبہ حضورؐ ایک باغ میں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک اُونٹ تھا جو

بھُوکا تھا۔ آپؐ کو دیکھ کر وُہ بلبلانے لگا جیسے آپؐ سے شکایت کر رہا ہو کہ مجھے مالک بھُوکا رکھتا ہے۔ آپؐ نے اس کے مالک کو بلوایا اور فرمایا: "اِس جانور کے معاملے میں تُم خُدا سے نہیں ڈرتے؟" آپؐ کا فرمان ہے کہ جانوروں پر زیادہ بوجھ نہ لادو اور ان کے کھانے پینے کا خیال رکھو۔

حضورؐ کی پُوری زندگی رحمت اور شفقت کے ایسے ہزاروں واقعات سے بھری پڑی ہے جِن میں سے چند واقعات کا ذکر ہم نے کیا ہے۔

مشق

1۔ بُوڑھی عورت حضورؐ پر کُوڑا کیوں پھینکتی تھی؟

2۔ حضورؐ نے اس بُوڑھی عورت کے ساتھ کیسا سلُوک کیا؟

3۔ ہمارے نبیؐ بچّوں کے ساتھ کیسا سلُوک کرتے تھے؟ (کوئی واقعہ سنائیے)۔

4۔ اس کہانی سے ہمیں کیا سبق حاصل ہوتا ہے؟

5۔ انسان وہ ہے جو حضرت مُحمّد صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے طریقے پر چلے۔ ایک مضمُون لکھیے جس میں حضورؐ کے طریقوں کا ذِکر ہو۔

6۔ ان الفاظ کے معنی لغات میں دیکھیے:۔ مقرّرہ۔ متانت۔ وقار۔ شفقت۔ بلا ناغہ۔ عیادت۔ اُنس۔ پرستش۔ معزّز۔

7۔ قدموں کی چاپ۔ ماتھے پر بَل آنا۔ دستک دینا۔ لرز جانا، کو اپنے جُملوں میں اِستعمال کیجیے۔

8۔ واقعات جمع ہے۔ اس کا واحد لفظ ہے "واقعہ"۔ اِسی طرح ان الفاظ کے واحد لکھیے:۔
خیالات۔ حالات۔ مشکلات۔

9۔ اس سبق سے دس ایسے لفظ چُنیے جو اِسم ہوں۔

قائدِ اعظمؒ نے فرمایا

آدھی رات کا وقت تھا۔ کراچی کا سارا شہر خاموشی اور تاریکی میں ڈُوبا ہُوا تھا۔ لوگ گہری نیند میں مدہوش تھے۔ لیکن ایک دو منزلہ مکان کا ایک کمرا ابھی تک روشن تھا۔ روشنی کی کرنیں کھڑکی سے چھن چھن کر باہر آرہی تھیں۔ کمرے کے اندر دُبلے پتلے جسم کا ایک لڑکا لیمپ جلائے کتاب پڑھ رہا تھا۔ اِس نے لیمپ کے گرد کاغذ کی آڑ کھڑی کر رکھی تھی تاکہ دُوسرے لوگوں تک لیمپ کی روشنی نہ پہنچے۔ وُہ اپنے مطالعے میں اِس قدر محو تھا کہ اُسے رات گزرنے کا احساس تک نہ ہُوا۔ وُہ مُسلسل پڑھے جا رہا تھا۔ برابر کے کمرے میں گھر کی کچھ خواتین سو رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک کی آنکھ کھُلی تو اُنھوں نے دیکھا، کمرے میں لیمپ جل رہا ہے۔ وُہ اُٹھ کر کمرے میں آئیں۔ دیکھا تو یہاں مطالعہ ہو رہا ہے اور دُنیا جہان کی کوئی خبر نہیں۔ اُنھوں نے کہا "بھیّا! شاید تُمھیں پتا نہیں چلا، آدھی رات گزر چُکی ہے۔ پڑھنا ختم کرو اور آرام سے سو جاؤ۔" وہ بولا "ہاں! مَیں جانتا ہوں آدھی رات گزر چُکی ہے، لیکن میں سو نہیں سکتا۔ اگر میں بھی دُوسرے لوگوں کی طرح سو جاؤں گا تو زندگی میں بڑا آدمی کیسے بن سکوں گا۔"

یہ دُبلا پتلا لڑکا بڑا ہو کر تاریخ کی ایک عظیم شخصیت بنا۔ اس کا نام محمّد علی جناح تھا۔ آدھی آدھی رات تک مطالعہ کرنے والا یہی لڑکا قائدِ اعظمؒ کہلایا، جس نے اپنی قابلیّت، محنت اور دیانت سے اپنی پُوری قوم کو نئی زندگی بخش دی۔ مُسلمانوں کو غلامی سے نجات دِلا کر ایک آزاد مُلک عطا کیا۔ وُہ مُلک یہی ہمارا پاکستان ہے۔

قائدِ اعظمؒ سے لوگ پُوچھتے تھے "پاکستان کیوں بنایا گیا؟" آپ اُنھیں بتاتے تھے: "مُسلمان دُوسری قوموں سے ایک الگ قوم ہیں، کیونکہ ان کی قومیّت کی بُنیاد کلمۂ توحید

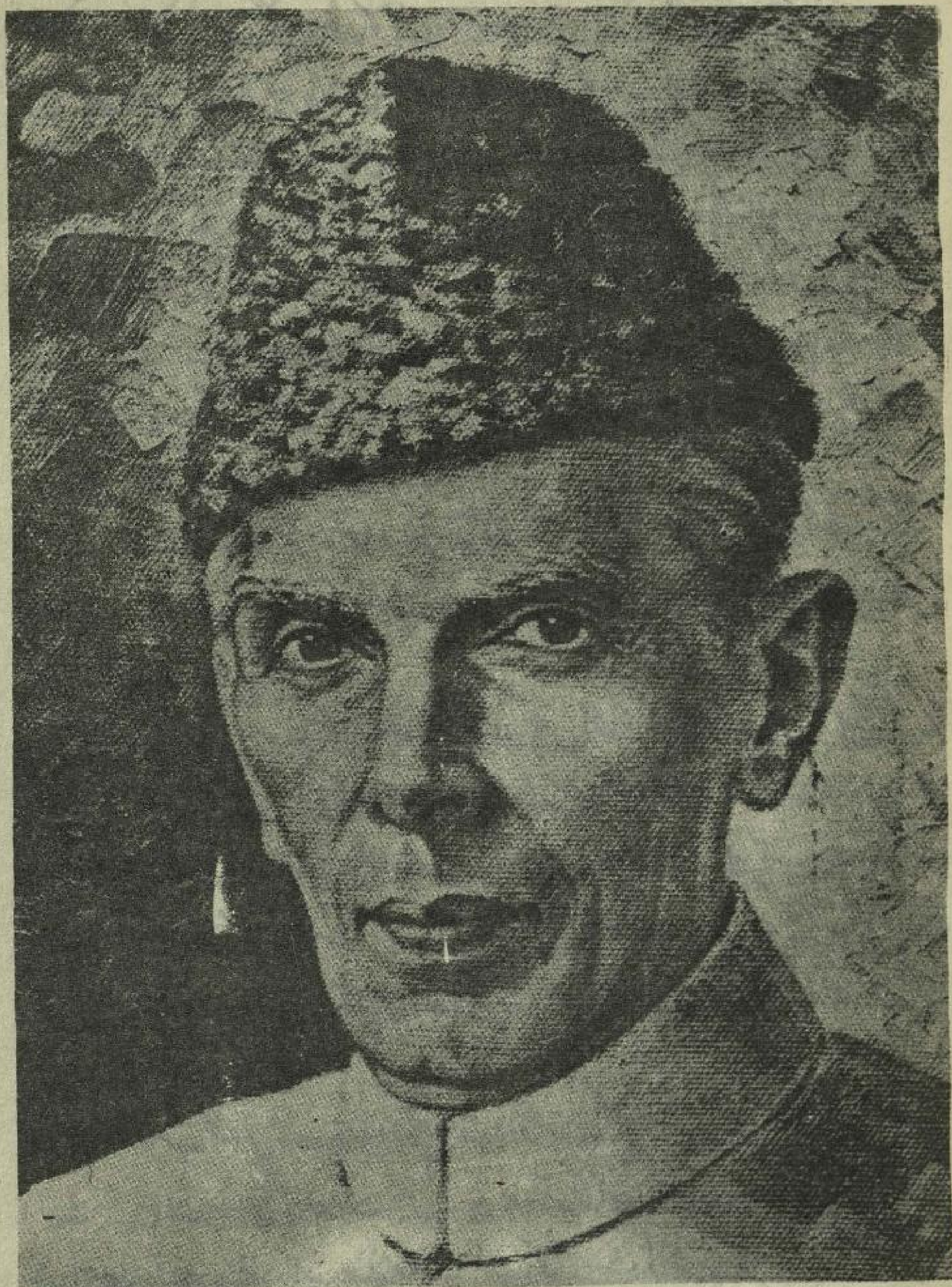
پر ہے۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم ایک ایسا مُلک بنائیں جس میں ہم آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں، جس میں اسلامی تہذیب کو زندہ کیا جائے اور جہاں اسلامی اقدار کو پروان چڑھنے کا موقع ملے۔"

پاکستان حاصل کرنے کے لیے قائدِ اعظمؒ نے مُسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا اور ہر طرح کے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وُہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتے تھے: "ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور قربانیاں دینا سیکھیں گے، اتنی ہی زیادہ پاکیزہ، خالص اور مضبُوط قوم بن کر اُبھریں گے، جیسے سونا آگ میں تپ کر کُندن بن جاتا ہے۔"

پاکستان بن گیا تو آپ نے اپنے ہم وطنوں کو ایک پیغام میں فرمایا: "ہم نے پاکستان حاصل کر لیا ہے لیکن یہ محض آغاز ہے۔ اب بڑی بڑی ذمّہ داریاں ہمارے کندھوں پر آپڑی ہیں۔ جتنی بڑی ذمّہ داریاں ہیں اُتنا ہی بڑا اِرادہ اور اِتنی ہی عظیم جدّوجُہد کا جذبہ ہم میں پَیدا ہونا چاہیے۔ جتنی قربانیاں پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے دی گئی ہیں، اس کی تعمیر و ترقی کے لیے بھی اتنی ہی قربانیوں کی ضرُورت ہے۔ حقیقی معنوں میں ٹھوس کام کا وقت آپہنچا ہے۔ قدرت نے آپ کو ہر چیز عطا فرمائی ہے۔ آپ کے پاس بے شمار وسائل ہیں۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اس کی تعمیر کریں۔ جلد سے جلد اور عُمدہ سے عُمدہ تعمیر۔ آگے بڑھیے اور بڑھتے ہی چلے جائیے۔"

قائدِ اعظمؒ کو اسلام کے ساتھ سچّی محبّت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کو نمونے کی اسلامی ریاست بنائیں۔ وُہ فرماتے تھے: "میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو پیغمبرِ اسلام نے ہمیں دیا ہے۔"

قائدِ اعظمؒ نے اپنی کوششوں سے مُسلمانوں کی بکھری ہُوئی طاقت کو یکجا کیا۔ انھیں ایمان، اتحاد اور تنظیم کا سبق دیا اور فرمایا: "ہم مُسلمان ایک خُدا، ایک رسُولؐ اور ایک کتاب پر یقین رکھتے ہیں۔ پس یہ لازم ہے کہ ہم مِلّت کی حیثیّت میں بھی ایک ہوں کیونکہ



قائدِ اعظمؒ

اتحاد میں طاقت ہے۔ اگر ہم خُود کو پنجابی، سندھی وغیرہ پہلے اور مُسلمان اور پاکستانی بعد میں سمجھنے لگیں گے تو پھر پاکستان پارہ پارہ ہو جائے گا۔ اب ہم سب پاکستانی ہیں۔ نہ بلوچی، نہ پٹھان، نہ سندھی، نہ پنجابی۔ ہمیں صِرف اور صِرف پاکستانی کہلانے پر فخر ہونا چاہیے۔ ہم جو کچُھ محسُوس کریں، جو کچُھ عمل کریں اور جو قدم بھی اُٹھائیں، وہ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے ہو۔ ہر شخص کو اپنے گاؤں، قصبے اور شہر سے محبّت ہونی چاہیے اور اس کی بہبُود اور ترقی کے لیے اسے محنت بھی کرنی چاہیے۔ یہ بہت اچھّی بات ہے لیکن اس سے زیادہ اچھّی بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے شہر اور قصبے کی نِسبت اپنے مُلک سے زیادہ محبّت ہو۔ ہمیں مُلک کی خاطر زیادہ لگن اور زیادہ شِدّت سے محنت کرنا چاہیے۔"

ہمارے قائدِ اعظمؒ کا حوصلہ نہایت بُلند تھا اور اُن میں ہمّت و جرأت کے اعلیٰ جوہر موجُود تھے۔ پاکستان کی راہ میں جب دُشمنوں نے طرح طرح کی مُشکلات پیدا کیں تو آپ نے فرمایا:

"خُدا کی قسم! جب تک ہمارے دُشمن ہمیں اُٹھا کر بحیرۂ عرب میں نہ پھینک دیں، ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لیے میں تنہا لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور جسم میں خُون کا ایک قطرہ بھی موجُود ہے۔ مجُھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اگر کبھی کوئی ایسا وقت آجائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لیے جنگ لڑنا پڑے تو کسی صُورت میں ہتھیار نہ ڈالیں اور میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑوں میں، دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں۔"

طالب علموں سے قائدِ اعظمؒ کو بے حد محبّت تھی۔ جب کبھی طالب علم انھیں اپنے ہاں بلاتے یا ان کی خِدمت میں حاضِر ہوتے تو آپ، اپنے بہت ضروری کام چھوڑ کر انھیں وقت دیتے۔ آپ نے طالب علموں کو نصیحت کی۔

"آپ تعلیم پر پُورا دھیان دیں۔ اپنے آپ کو عمل کے لیے تیاّر کریں۔ یہ آپ

کا سب سے پہلا فرض ہے۔ آپ کی بھلائی، آپ کے والدین کی بھلائی بلکہ ساری مملکت کی بھلائی اس میں ہے کہ آپ صرف علم حاصل کرنے کی طرف توجہ دیں۔ تعلیم ہماری قوم کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دُنیا اِتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہ بنایا تو نہ صرف یہ کہ آپ پیچھے رہ جائیں گے بلکہ خدانخواستہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔ تعلیم کی اشاعت کے لیے بڑی سے بڑی قُربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس مقصد کی خاطر جتنی بھی مصیبتیں جھیلی جائیں کم ہیں۔"

قائدِاعظم زندہ باد

مشق

1- قائدِاعظمؒ کے معنی کیا ہیں؟

2- قائدِاعظمؒ نے بڑا آدمی بننے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟

3- طالب علموں کو قائدِاعظمؒ کی نصیحت کے مطابق کیا کرنا چاہیے؟

4- محو۔ عظیم۔ نجات۔ کُندن۔ جدوجہد۔ مستورات۔ اسوۂ حسنہ۔ اشاعت۔ دریغ کرنا کے معنی یاد کیجیے اور انھیں اپنے جُملوں میں استعمال کیجیے۔

5- اچھا پاکستانی بننے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اپنے ساتھیوں سے اس کے متعلق بات چیت کیجیے۔

6- ایک چارٹ پر قائدِاعظمؒ کے اصُول خُوش خط لکھیے۔

7- حرف اس لفظ کو کہا جاتا ہے جس کے اپنے کچھ معنی نہ ہوں لیکن وہ جُملہ بنانے میں مدد دیتا ہو مثلاً میں، سے، کو وغیرہ۔ آپ اِس سبق کے پہلے پیرے سے دس ایسے حروف چُنیے۔

چاند میری زمیں پھول میرا وطن

چاند میری زمیں پھول میرا وطن
میرے کھیتوں کی مٹّی میں لعلِ یمن



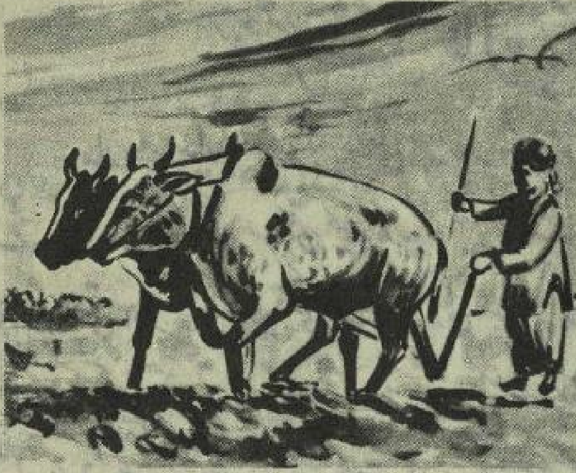
میرے ملاّح لہروں کے پالے ہُوئے
میرے دہقاں پسینوں کے ڈھالے ہُوئے
میرے مزدُور اس دَور کے کوہکن
چاندٌ میری زمیں پھول میرا وطن



میرے فوجی جواں ، جرأتوں کے نشاں
میرے اہلِ قلم عظمتوں کی زباں
میرے محنت کشوں کے سُنہرے بدن
چاند میری زمیں پھول میرا وطن



میری سرحد پہ پہرا ہے ایمان کا
میرے شہروں پہ سایہ ہے قرآن کا
میرا اِک اِک سپاہی ہے خیبر شکن
چاند میری زمیں پھول میرا وطن



میرے دہقاں یُوں ہی ہل چلاتے رہیں
میری مٹّی کو سونا بناتے رہیں
گیت گاتے رہیں میرے شُعلہ بدن
چاند میری زمیں پھُول میرا وطن

(ساقی جاوید)

مشق

1۔ یہ نغمہ زبانی یاد کیجیے اور جماعت میں ہل کر پڑھیے۔
2۔ شاعر نے اپنے ہم وطنوں کی جو جو خُوبیاں بیان کی ہیں، وہ سادہ الفاظ میں لکھیے۔
3۔ کسی رسالے یا کتاب سے ایک اچھّا سا قومی نغمہ اپنی کاپی میں لکھیے۔
4۔ لعلِ یمن۔ کوہ کن۔ عظمت۔ محنت کش۔ خیبر شِکن۔ شعلہ بدن کے معنی یاد کیجیے۔
5۔ وطن کے ہم قافیہ الفاظ اس نظم سے چُن کر لکھیے اور ان کے ساتھ پانچ لفظ اپنی طرف سے بھی شامل کیجیے۔

حضرت عُثمان غنیؓ کا اِیثار

ہمارے پیارے نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم مکّے سے ہجرت کر کے مدینے تشریف لے آئے تھے۔ آپؐ کے ساتھی بھی مدینے میں آپؐ کے ساتھ تھے۔ مُسلمانوں کی مالی حالت بہت خراب تھی اور وُہ بڑی تنگی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

اُن دِنوں مدینے کے قریب میٹھے پانی کا ایک ہی کنوّاں تھا جس کا نام بئرِ رومہ تھا۔ عربی میں کنوئیں کو بئرِ کہتے ہیں۔ بئرِ رومہ کا مالک ایک یہوُدی تھا جو بڑا لالچی اور سنگدِل آدمی تھا۔ وُہ اپنے کنوئیں کا پانی فروخت کیا کرتا تھا۔ یوں تو وُہ سبھی کے ساتھ سختی سے پیش آتا لیکن مُسلمانوں سے اُسے خاص طور پر نفرت تھی۔ اس لیے وُہ مُسلمانوں کے ہاتھ اور بھی مہنگے داموں پانی بیچتا۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ کوئی غریب مُسلمان کنوئیں پر پانی لینے آتا تو یہوُدی پانی دینے سے اِنکار کر دیتا۔ وہ ہزار مِنّت سماجت کرتا اور اسے بتاتا کہ گھر میں بچّے پیاس سے بِلک رہے ہیں، لیکن وہ ظالم ذرا پروا نہ کرتا بلکہ اُن کی تکلیفوں پر دِل ہی دِل میں خُوش ہوتا۔

مدینے کے سبھی لوگ اُس سنگدِل کے ہاتھوں تنگ تھے۔ نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم لوگوں کو تکلیف میں دیکھتے تو آپؐ کو بہت رنج ہوتا۔ آپؐ چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہُوئی نعمتوں سے سب انسانوں کو نفع پہنچے۔ آپؐ نے ایک دن مسجد میں اعلان فرمایا کہ جو شخص یہوُدی سے یہ کنوّاں خرید کر وقف کر دے گا، اللہ تعالیٰ اُسے جنّت عطا کرے گا۔

یہ سُن کر ہر صحابی نے دِل میں سوچا، کاش یہ سعادت اسے حاصل ہو جائے! اِتنے میں ان میں سے ایک صحابی چُپکے سے اُٹھے اور سیدھے اُس یہوُدی کے پاس پہنچے۔

اُنھوں نے یہُودی سے کنّوئیں کا سودا کرنا شرُوع کیا۔ وہ کنوّاں بیچنے پر آمادہ نہ تھا لیکن جب اُنھوں نے اُسے یقین دلایا کہ وُہ اُسے منہ مانگے دام دینے کو تیار ہیں تو وہ اس شرط پر مان گیا کہ چار ہزار درہم میں کنّوئیں کا صِرف آدھا حصّہ فروخت کرے گا اور کنّوئیں پر ایک دن مُسلمانوں کا حق ہو گا اور دُوسرے دن یہُودی کا۔ اُس صحابی نے یہ شرط مان لی اور فوراً رقم ادا کر دی۔

جِس دن کنّوئیں پر مُسلمانوں کی باری ہوتی اُس دن ہر شخص کو اجازت ہوتی کہ وُہ جِتنا چاہے پانی لے لے۔ حتیٰ کہ مدینے کے یہُودی بھی اُس دن مُفت اور جی بھر کر پانی لے لیتے۔ اگلے دن جب یہُودی کی باری ہوتی تو کوئی بھی اُس سے پانی خریدنے نہ آتا۔ رفتہ رفتہ اُس کا کاروبار ختم ہو گیا۔ مجبُور ہو کر اُس نے آدھا حِصّہ بھی بیچ دیا۔ اِس طرح حضورؐ کے صحابی نے کُل آٹھ ہزار درہم میں کنوّاں خرید کر وقف کر دیا۔ حضورؐ کے اس صحابی کا نام عثمانؓ بن عفّان تھا۔

حضرت عثمان غنیؓ مکّے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ اُن کی تجارت دُور دُور تک پھیلی ہُوئی تھی۔ اُن کے تجارتی قافلے دُوسرے ممالک میں مال لے کر جاتے اور بہت سا نفع کما کر لاتے۔ اُن کے پاس بہت سی دولت تھی، لیکن آپ اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ مُسلمانوں پر جب کبھی تنگی کا وقت آتا تو حضرت عثمان غنیؓ اپنی خدمات پیش کر دیتے۔ انھیں اپنے مال و دولت سے محبت نہ تھی بلکہ اللہ اور اللہ کے رسُولؐ سے سچا پیار تھا۔ حضورؐ کے دل میں بھی اُن کی بڑی جگہ تھی، چنانچہ آپؐ نے یکے بعد دیگرے اپنی دو بیٹیوں حضرت رقیہؓ اور حضرت اُمِ کلثُومؓ کی شادی ان کے ساتھ کی تھی۔

حضرت عثمان غنیؓ نے اللہ کی خاطر دو بار ہجرت کی۔ سب سے پہلے جب مُسلمان نبی کریمؐ کے حکم کے مطابق مکّے سے حبشہ کو روانہ ہُوئے تو حضرت عثمان غنیؓ اس پہلے گروہ میں شامل تھے۔ اس کے بعد جب اللہ کے حُکم سے حضورؐ بھی ہجرت فرما کر مدینے جانے کو تیّار ہُوئے

توحضرت عثمان غنیؓ اپنی ساری جائیداد مکّے میں چھوڑ کر ہجرت کر گئے اور ہمیشہ کے لیے مدینے کے ہو رہے۔

حضرت عثمان غنیؓ انسانوں کی بھلائی اور مُسلمانوں کی بہبُود کے لیے دِل کھول کر مال خرچ کرتے تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر تمام صحابہ نے اپنی اپنی حیثیّت کے مطابق جہاد کے لیے مال جمع کرایا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے آدھی فوج کے تمام اخراجات اپنے ذمّے لے لیے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے نو سو پچاس گھوڑوں اور اُونٹوں کا اِنتظام بھی کیا۔

حضرت عثمانِ غنیؓ دل کے بہت سخی تھے۔ انھیں دولت اور سخاوت کی وجہ سے غنی کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ وُہ کِسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے تھے۔ خود نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا لباس سادہ اور کم قیمت ہوتا تھا۔ وہ عام مُسلمانوں میں اس طرح بیٹھتے تھے کہ کِسی طرح کا امتیاز نظر نہیں آتا تھا۔ اپنی خلافت کے زمانے میں بھی اکثر مسجد نبوی ہی میں چادر بچھا کر سو جاتے۔ وُہ بہت مہمان نواز تھے۔ اپنے مہمان کو پُر تکلّف کھانا پیش کرتے لیکن اپنے لیے سادہ اور معمُولی غذا پسند کرتے تھے۔

ایک دفعہ مدینے میں قحط پڑ گیا۔ شہر میں غلّہ کہیں میسّر نہ تھا۔ اگر کہیں سے غلّہ مِل بھی جاتا تو وہ اِس قدر مہنگا ہوتا کہ غریب لوگ اسے خریدنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ اِنھی دِنوں حضرت عثمان غنیؓ کا تجارتی قافلہ آ گیا۔ اس قافلے میں غلّے کے لدے ہوُئے ایک ہزار اُونٹ تھے۔ ابھی یہ قافلہ شہر سے دُور تھا کہ غلّے کے تاجروں کو پتا چل گیا۔ تاجر حضرت عثمان غنیؓ کے پاس غلّے کا سودا کرنے کے لیے پہنچ گئے۔

حضرت عثمانِ غنیؓ نے تاجروں سے پُوچھا "بتاؤ مُلک شام کی خریداری کے بھاؤ پر تُم کیا نفع دو گے؟" اُنھوں نے کہا "دس کے بارہ لے لیجیے"۔ اُنھوں نے فرمایا "مجھے اس سے زیادہ نفع مِل رہا ہے"۔ تاجروں نے کہا "دس کے پندرہ لے لیجیے"۔ اُنھوں نے پھر وہی جواب دیا کہ مجُھے اِس سے زیادہ نفع مِل رہا ہے۔ سودا کرتے کرتے تاجر دوگُنا نفع دینے پر آمادہ ہو گئے

لیکن آپ نے فرمایا "مجھے تو دس گُنا بلکہ اس سے بھی زیادہ نفع مل رہا ہے۔ اس لیے مَیں آپ لوگوں کے ہاتھ غلّہ نہیں بیچ سکتا۔" تاجروں نے کہا "اتنا نفع دینا تو ہمارے بس میں نہیں۔" سب تاجر حیران تھے کہ وُہ کون ہے جو ان کو اتنا زیادہ نفع دے کر اتنے مہنگے داموں غلّہ خرید رہا ہے۔ اسی اثنا میں تجارتی قافلہ مدینے آ پہنچا۔ اُونٹوں سے غلّہ اُترنا شروع ہُوا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے حُکم دیا کہ تمام غلّہ ایک جگہ ڈھیر کر دیا جائے۔ اس کے بعد آپ نے سارے شہر میں منادی کرا دی کہ مدینے کے تمام محتاج اور فقیر لوگ آئیں اور اپنی اپنی ضرُورت کے مطابق غلّہ لے جائیں۔

منادی سُن کر لوگ دوڑے آئے اور سب اپنی اپنی ضرُورت کے مطابق غلّہ اُٹھا کر لے گئے۔ سارا غلّہ مدینے والوں میں تقسیم ہو گیا۔ قحط کی تنگی دُور ہو گئی۔ یہ بات اب تاجروں کی سمجھ میں بھی آ گئی کہ اتنا نفع دینے والا کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ جو آدمی اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرے گا، اللہ تعالیٰ اُسے دس گُنا یا اُس سے بھی زیادہ اَجر دے گا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے خُدا کی خوشنُودی حاصِل کرنے کو ترجیح دی اور دُنیاوی مال کی پروا نہ کی۔

مشق

1 - حضرت عثمان غنیؓ نے اپنی دولت کیسے کاموں پر خرچ کی؟

2 - حضرت عثمان غنیؓ نے تاجروں کے ہاتھ غلّہ فروخت کیوں نہ کیا؟

3 - بئرِ رومہ کا واقعہ کہانی کی صُورت میں بیان کیجیے۔

4 - ہجرت۔ سنگدل۔ وقف کرنا۔ صحابی۔ سائل اور قحط کو تہجّی ترتیب سے لکھیے اور ان کے معنی درج کیجیے۔

5 - مہنگے داموں۔ بکنا۔ مُنہ مانگے دام۔ رفتہ رفتہ۔ منادی کرانا کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

6 - "کاش" ایسا حرف ہے جو خواہش یا تمنّا کو ظاہر کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ بتائیے نیچے لکھے ہُوئے حروف کن موقعوں پر بولے جاتے ہیں؟

واہ وا۔ شاباش۔ اُوہ۔ ہائے ہائے۔

اُستاد کا اِحترام

خلیفہ ہارُون الرّشید مسلمانوں کا ایک مشہُور خلیفہ تھا۔ اس کے زمانے میں مُسلمانوں کی سلطنت دُور دُور تک پھیلی ہُوئی تھی۔ ہر طرف عِلم کا چرچا تھا اور لوگوں کو عِلم حاصِل کرنے کا بہت شوق تھا۔ علما اور اساتذہ کو بہت عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خلیفہ خود بھی علما اور اساتذہ کا بے حد اِحترام کرتا تھا اور اس کے دربار میں انھیں بلند مرتبہ حاصل تھا۔

خلیفہ کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام مامون تھا اور دُوسرے کا امین۔ دونوں صاحبزادوں کو عِلم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ وُہ اپنے اساتذہ کی بہت عزّت کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذِکر ہے کہ دونوں صاحبزادے اپنے والد خلیفہ ہارون الرّشید کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے جامع مسجد میں گئے۔ اُس مسجد میں مامون اور امین کے اُستاد بھی موجُود تھے۔ جب جُمعہ کی نماز ختم ہُوئی اور لوگ اپنے اپنے جوتے اُٹھائے مسجد سے باہر جانے لگے تو دونوں صاحبزادے مسجد کے اس کونے کی طرف لپکے جہاں اُن کے اُستادِ مُحترم کے جُوتے رکھّے ہُوئے تھے۔ دونوں میں سے ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے اُستاد کے جُوتے اُٹھائے۔ لیکن اتفاق یہ کہ دونوں ایک ساتھ وہاں پہنچے اور ایک نے ایک جُوتا اُٹھالیا، دُوسرے نے دُوسرا۔ خلیفہ ہارون الرّشید ذرا فاصلے پر کھڑا یہ سب ماجرا دیکھ رہا تھا اور دِل ہی دِل میں خُوش ہو رہا تھا۔

اگلے روز جب خلیفہ اپنے مصاحبوں، وزیروں اور دوستوں کے ساتھ دربار میں بیٹھا تو اُس نے اُن سے پُوچھا: "تمھارے خیال میں سب سے زیادہ خُوش نصیب انسان کون ہے؟"

مصاحبوں میں سے ایک نے جواب دیا: "حضور آپ کو خُدا نے مُسلمانوں کا

خلیفہ بنایا ہے اور یوں آپ کا رُتبہ سب سے بُلند کیا ہے۔ آپ سے زیادہ خُوش نصیب بھلا اور کون ہو گا؟" خلیفہ نے کہا "نہیں! ایک شخص مجھ سے بھی زیادہ خُوش نصیب ہے"۔ مصاحبوں نے پُوچھا "حضُور وُہ کون شخص ہے؟ ہم بھی تو جانیں!"

خلیفہ نے جواب دیا "سب سے زیادہ خُوش نصیب وُہ اُستاد ہے جس کے جُوتے خلیفۂ وقت کے بیٹے اُٹھاتے ہیں اور اسے اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں"۔

اُستاد بلا شبہ دُنیا کا سب سے خُوش نصیب شخص ہے۔ خُوش نصیب اس لحاظ سے کہ اسے وُہ فرض سونپا گیا ہے جو خُدا نے اپنے رسُولوں اور پیغمبروں کو سونپا تھا، یعنی لوگوں کو تعلیم دینا اور دُنیا کو علم کی روشنی سے منوّر کرنا۔ علم کا درجہ بہت بُلند ہے اور جو شخص خُود علم حاصل کرتا ہے اور پھر اِس علم کو آگے پھیلاتا ہے، اس کا رُتبہ یقیناً بہت ہی بُلند ہے۔ جب اُستاد نہیں تھا تو دُنیا میں جہالت کی تاریکی تھی۔ اُستاد نے اس تاریکی میں علم کی شمع روشن کی تو یہ اندھیرا اُجالے میں بدل گیا۔ علم کی بدولت دُنیا میں تہذیب کا نُور پھیلا۔ لوگوں کو رہنے سہنے کا سلیقہ آیا۔ ہر لحاظ سے ترقی ہُوئی۔ چونکہ اس ترقّی اور تہذیب کا سہرا اُستاد کے سر ہے اس لیے اُستاد کا اِحترام ہم سب پر لازم ہے۔

اسلام میں اُستاد کا رُتبہ بہت بُلند ہے۔ ہمارے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا ارشاد ہے کہ اُستاد کی حیثیّت رُوحانی باپ کی ہے اور اس کا حق اپنے شاگردوں پر اُتنا ہی ہے جتنا کسی باپ کا حق اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے مجھے ایک حرف بھی پڑھا دیا وُہ میرا آقا قرار پایا۔ اگر ایک حرف پڑھانے والے اُستاد کا رُتبہ اِس قدر بُلند ہے تو اس اُستاد کی عظمت اور رُتبے کا اندازہ لگائیے جو اِنسان کو نہ صرف علم کے زیور سے آراستہ کرتا ہے بلکہ اسے کامیاب زندگی بسر کرنے کے آداب بھی سکھاتا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو شاگرد اپنے اساتذہ کی زیادہ عزّت کرتے ہیں، وُہ

عِلم کے فائدے

عِلم اِک لازوال دولت ہے
عِلم اِک بے مثال طاقت ہے
عِلم ہی سے خُدا کو پہچانا
عِلم ہی سے بُرا بھلا جانا
عِلم ہی سب ہُنر سکھاتا ہے
عِلم ہی آدمی بناتا ہے
عِلم سے آدمی کی عِزّت ہے
عِلم سے آدمی میں ہمّت ہے
عِلم نے عقل کو جِلا دی ہے
نئی دُنیا ہمیں دکھا دی ہے
ہر سمندر میں تیرنے کے لیے
بن گئے عِلم سے جہاز نئے
ہر طرف اُڑ رہے ہیں طیّارے
ہیں بنے عِلم ہی سے یہ سارے
عِلم کی دُھن جسے لگی ہی نہیں
سچ تو یہ ہے، وُہ آدمی ہی نہیں

یہ اثر ہو دُعائے نیّرؔ میں
عِلم کی روشنی ہو گھر گھر میں

(شفیع الدین نیّرؔ)

مشق

1 - اِس نظم میں عِلم کے جو فائدے بیان کیے گئے ہیں، انھیں سادہ لفظوں میں لکھیے۔
2 - "عِلم لازوال دولت ہے" اس کا مفہوم سمجھائیے۔
3 - لُغت سے ان الفاظ کے معنی تلاش کیجیے:۔ بُرا بھلا جاننا۔ جِلا دینا۔ دُھن لگنا۔ نئی دُنیا دکھانا۔
4 - "عِلم کی روشنی گھر گھر میں ہو"۔ اس میں لفظ گھر دو بار استعمال ہوا ہے۔ آپ بھی پانچ ایسے جُملے بنائیے جن میں کوئی لفظ دو بار استعمال ہوتا ہو۔ مثلاً سوداگر مُلک مُلک کی سَیر کرتے ہیں۔ سُورج کی روشنی دُور دُور تک پھیل گئی۔

اِسلامی ممالک کا اِتّحاد

کہتے ہیں، ایک شخص کے پانچ بیٹے تھے۔ سب کے سب خُوش شکل، جوان اور صحت مند تھے لیکن وُہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ان میں اتّفاق نہ تھا۔ ان کا باپ انھیں اکثر سمجھاتا کہ دیکھو اتّفاق میں برکت ہے۔ اگر تم مِل جُل کر رہو گے تو تمھاری عزّت ہو گی، طاقت بڑھے گی، لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

ایک دن اُس نے اپنے بیٹوں کو اپنے پاس بُلایا اور کہا کہ جاؤ ساتھ والے باغ سے ایک ایک لکڑی اُٹھا لاؤ۔ پانچوں بیٹے ایک ایک لکڑی اُٹھا لائے۔ باپ نے سب سے بڑے بیٹے کو کہا: "ان پانچوں لکڑیوں کو ایک رسّی سے باندھ دو۔" پھر لکڑیوں کے اس گٹھّے کو باری باری سب لڑکوں کو دیا اور ہر ایک سے کہا کہ اس گٹھّے کو توڑ کر دکھائے۔ ہر کسی نے خُوب زور لگایا لیکن لکڑیوں کا گٹھّا کسی سے بھی نہ ٹُوٹا۔

یہ دیکھ کر وُہ شخص مُسکرایا اور لکڑیوں کے گٹھّے کو کھُلوا کر لڑکوں سے کہا کہ اپنی اپنی لکڑی واپس لے لو اور توڑ ڈالو۔ لڑکوں نے اپنی اپنی لکڑی اُٹھائی اور اُسے بڑی آسانی سے توڑ دیا۔ اس پر باپ نے بیٹوں سے کہا "اگر تُم ان لکڑیوں کے گٹھّے کی طرح متّحد ہو کر رہے تو ہمیشہ طاقت ور رہو گے، لیکن اگر لکڑیوں کی مانند الگ الگ ہو گئے تو دشمن کا مقابلہ نہ کر سکو گے اور ہر کوئی تمھیں آسانی سے نیچا دِکھا سکے گا۔" بیٹوں نے اپنے باپ کی بات مان لی اور مِل جُل کر رہنے لگے۔

اِس کہانی میں ہمارے لیے ایک سبق ہے اور وُہ سبق ہے اتّفاق اور اتّحاد کا، محبّت اور پیار کا، آپس میں مِل جُل کر رہنے کا۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ جب تک ہم مِل جُل کر رہے، مضبُوط اور طاقت وَر رہے اور دُشمن پر غالب رہے، لیکن جب ہم

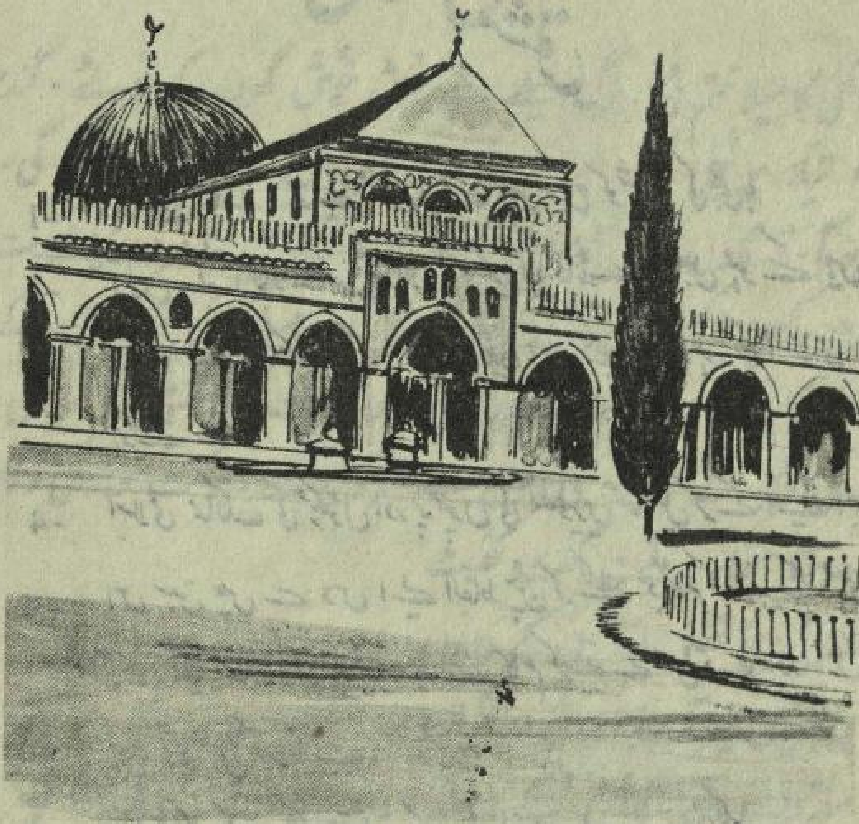
نے اتّحاد کو چھوڑ دیا، کمزور ہو گئے اور دُشمن ہم پر غالب آگیا۔

دُور کیوں جائیے، پاکستان ہی کو لیجیے! یہ مُلک اس نام سے دُنیا میں موجُود نہ تھا۔ یہاں کے مُسلمان ایک طرف انگریز کے غُلام تھے اور دُوسری طرح ہندُو ان پر غلبہ پا رہے تھے۔ ان دونوں سے آزادی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ یہاں کے مُسلمان آپس میں متّحد ہو جائیں اور اپنے اختلافات ختم کر دیں۔ انھی دِنوں اللہ تعالیٰ نے مُسلمانوں کو بڑے نیک اور مخلص رہنُما بخشے، جنھوں نے اسلامی اتّحاد کے لیے بڑی محنت کی اور بڑی قُربانیاں دیں۔ سرسیّد، جمال الدّین افغانی، مولانا شوکت علی، مُحمّد علی جوہر، علامہ اقبال اور قائدِ اعظم، یہ سب مُسلمانوں کے عظیم رہنُما تھے۔ اُنھوں نے پُوری قوم کو متحد کر دیا۔ اُنھیں ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ اس جذبے کے تحت ہندوستان کے مُسلمانوں نے متّحد ہو کر ایک آزاد اسلامی ریاست کا مُطالبہ کر دیا اور چند سال کی مُسلسل جدّوجہد سے ایک آزاد اسلامی ریاست پاکستان کے نام سے قائم کر لی۔

اب عربوں کی مثال لیجیے۔ چند برس پہلے تک ان میں اتّفاق نہ تھا۔ مِصر، شام، عراق، اُردن، سعودی عرب غرض کہ تمام ممالک باہمی اختلافات کا شکار تھے۔ اُن کی نااتّفاقی سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے انھی کی سرزمین پر یہُودیوں کو آباد کر دیا گیا اور اسرائیل کے نام سے ایک نیا مُلک قائم ہو گیا۔ پھر اسی اسرائیل نے عربوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر مِصر، شام اور اُردن پر حملہ کر کے ان مُلکوں کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ انھی علاقوں میں مُسلمانوں کا پیارا شہر بیتُ المَقدس بھی تھا۔

جب عربوں نے اپنے آپ کو مِٹتے دیکھا تو ان میں یہ احساس پیدا ہُوا کہ اُنھیں اکٹھّے ہو کر اسرائیل کا مقابلہ کرنا چاہیے، چنانچہ اُنھوں نے آپس میں متّحد ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سِلسلے میں سب سے زیادہ کوشش سعودی عرب کے شاہ فیصل شہید نے کی۔ عربوں نے فیصلہ کیا کہ اب ہم اپنے علاقے اِسرائیل سے واپس لے کر رہیں گے۔ بیت المقدس کو آزاد کرائیں گے۔

عربوں نے متحد ہو کر اسرائیل سے جنگ کی اور بہت سا علاقہ آزاد کرالیا۔ لیکن ابھی بہت سے علاقے واپس لینا باقی ہیں، فلسطین کو بھی آزاد کرانا ہے۔ یہ سب کچھ اِتّحاد سے ہوگا۔ خُدا کا شُکر ہے کہ اس وقت دُنیا کے تمام مُسلمانوں میں اِتّحاد کا احساس پیدا ہو چُکا ہے۔ سب اِسلامی ممالک ایک



دُوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ اسلامی سربراہوں کی کانفرنس جو 1974ء میں لاہور میں منعقد ہوئی، اس اتّحاد کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اب اسلامی ممالک میں خُدا کے فضل سے تعاوُن بڑھ رہا ہے۔ ان کی دوستی مضبُوط ہو رہی ہے۔

تیل کی دولت جو موجُودہ زمانے میں سب سے بڑی دولت ہے، انھی کے پاس ہے۔ معدنیات کے ذخیرے انھی کے پاس ہیں۔ ہری بھری کھیتیاں اور باغات ان کے پاس ہیں اور ان سب سے بڑھ کر محنتی اور جفاکش انسان جو دُنیا پر چھا جانے کا عزم اور حوصلہ رکھتے ہیں، وہ بھی یہاں موجُود ہیں۔ صِرف ایک کمی اتّحاد کی تھی، وُہ بھی اب خُدا کے فضل سے پُوری ہو رہی ہے۔ اس لیے اب ان مُلکوں کو چاہیے کہ ایک دُوسرے

سے پُورا تعاون کریں، امن ہو یا جنگ ہر حال میں ایک دُوسرے کا ساتھ دیں۔

مشق

1۔ پاکستان بنانے کے لیے مُسلمانوں نے کِس طرح کوشش کی تھی؟

2۔ آپس کے اتحاد سے مُسلمانوں کو کیا کیا فائدے حاصِل ہو سکتے ہیں؟

3۔ دس ایسے ممالک کے نام اپنی کاپی میں لکھیے جو لاہور کی اسلامی کانفرنس میں شریک ہُوئے تھے۔

4۔ اسلامی ممالک کی ٹکٹوں اور پرچموں کی تصویریں حاصل کر کے اپنے البم میں لگائیے۔

5۔ اس سبق میں سے دس ایسے الفاظ چُن کر لکھیے جو کام کرنے کے معنی دیتے ہوں۔ مثلاً آتا ہے، گیا تھا، لِکھا وغیرہ۔ جو لفظ کام کرنے کے معنی دے اور اس میں زمانہ بھی پایا جاتا ہو، وُہ فعل کہلاتا ہے۔

6۔ اتفاق کی برکتوں کے متعلق ایک کہانی اپنی طرف سے لکھیے۔

گندم کی کٹائی

بیساکھی کا میلا ختم ہُوا۔ لوگ میلے سے خُوشِ خُوش گھروں کو لَوٹے۔ گندم کی فصل پک کر تیّار ہو چُکی ہے۔ اب جلد ہی کھیتوں میں درانتی پڑ جائے گی۔ فصل کٹنا شُروع ہو گی تو گاؤں کا ہر آدمی مصرُوف ہو جائے گا۔ کیا مرد، کیا عورت سبھی فصل سمیٹنے میں کِسی نہ کِسی طرح ضرُور حِصّہ لیں گے۔ بیساکھ کی آمد کسان کے لیے ایک نئے دَور کا پیغام لاتی ہے۔ یہ دَور اس کی دن رات کی مشقّتوں کا حاصِل ہے۔

گندم کی کٹائی کے سامان کئی دِنوں سے شُروع تھے۔ برکت لوہار کی دُکان پر ہر روز ہجُوم رہتا تھا۔ ہر وقت کھَٹ کھَٹ کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں اور اُس کے دونوں بڑے بیٹے درانتیاں تیز کرنے اور نئی درانتیاں بنانے میں مصرُوف تھے۔ گاؤں کے چند نوجوان بھی اُن کی مدد کے لیے دُکان پر آجاتے۔ کوئی دھونکنی چلاتا اور کوئی ہتھوڑے سے لوہا کوٹتا۔ آگ اور لوہے کا یہ کھیل بہت مشقّت طلب ہے۔ کام کرنے والے پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی خُوش نظر آتے ہیں۔ اِس لیے کہ دِن رات محنت مشقّت میں لگے رہنا ہی ان کی زندگی ہے اور اِسی میں اُن کی خُوشیوں کا راز پوشیدہ ہے۔



گاؤں کے اِرد گِرد دُور دُور تک گندم کے کھیت پھیلے ہُوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اِس سال فصل بہت اچھّی ہے۔ گندم کے قد آور پودے



سُنہرے سُنہرے خوشوں سے لدے ہُوئے ہیں۔ ہَوا چلتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سونے کے سمنّدر میں لہریں اُٹھ رہی ہوں۔ محنت کا یہی وُہ ثمرہ ہے جو کِسان کی ہمّت بڑھاتا اور اُس میں اور زیادہ کام کرنے کی اُمنگ پَیدا کرتا ہے۔

اِس سال نادر خاں نے پہل کی۔ رات کو گھر گھر جا کر بُلاوا دے آیا کہ کل صُبح میرے ہاں "وَنگار" ہو گی۔ "وَنگار" پنجاب کی پُرانی رسم چلی آتی ہے۔ یہ فصل کی کٹائی کی دعوت ہے جِس میں گاؤں کے ہر شخص کو بُلایا جاتا ہے۔ سبھی مِل کر ایک یا دو دن میں

کسی ایک ساتھی کی فصل سمیٹ لیتے ہیں۔ پھر دُوسرے کے ہاں چلے جاتے ہیں۔اِسی طرح مل جُل کر چند ہی دِنوں میں سارے کے سارے کھیت کاٹ ڈالتے ہیں۔ اگر ہر ایک کو خُود ہی یہ سارا کام کرنا پڑتا تو بہت تکلیف ہوتی، لیکن دیہات کے لوگ ایک دُوسرے کی ضرُورت میں کام آتے ہیں اور کام میں ایک دُوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ کٹائی کے دِنوں میں یُوں نظر آتا ہے کہ سارا گاؤں ایک ہی خاندان سے تعلّق رکھتا ہے۔ اِسی کا نام ہمدردی اور تعاون ہے۔ ہمارے دِین نے بھی ہمیں یہی سکھایا ہے۔

کٹائی کا دِن آ پہنچا۔ کریا بھرائی آج سویرے ہی جاگ اُٹھا۔ جلدی جلدی مُنہ پر ایک دو چھینٹے مار، ڈھول اُٹھا کر چوپال میں جا کھڑا ہُوا اور زور زور سے ڈھول بجانے لگا۔ ڈھم ڈھم ڈھم۔ ڈھما ڈھم ڈھم۔ ڈھول پر چوٹ پڑی تو پُورے گاؤں میں جوش وخروش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ نوجوان اور ادھیڑ عُمر مرد اپنی اپنی درانتیاں سنبھالے چوپال کو روانہ ہُوئے۔ لڑکے بالے بھی دوڑے آئے اور ڈھول کے گرد گھیرا ڈال کر ناچنے گانے لگے۔

سَب آچکے تو کھیتوں کی طرف روانہ ہُوئے۔ کریا ڈھول بجاتا جا رہا ہے۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی بولیاں گا رہی ہے۔ دُوسری ٹولی بھنگڑا ڈال رہی ہے۔ یہ دیہی مُجاہدوں کی فوج ہے جو اپنے محاذ کی طرف رَواں دَواں ہے۔

کھیت پر پہنچ کر سب نے کام کرنے کے لیے کمر باندھ لی، تہمد اُڑس لیے، کھدّر کی موٹی چادریں سَر پر لپیٹ لیں اور اُن کے پلّو گردن اور پُشت پر ڈال لیے تاکہ دُھوپ کی تیزی سے کوئی گزنْد نہ پہنچے۔ آستینیں چڑھانے کی ضرُورت محسُوس نہیں ہُوئی، اِس لیے کہ اکثر نے قمیص یا کُرتہ نہیں پہن رکھّا ہے۔ زیادہ تر ننگے بَدن ہی کام کرتے ہیں۔

گاؤں کے ایک بُزرگ نے دَرانتی سنبھالی اور بِسم اللہ کہ کر ایک مُٹھا کاٹ لیا۔ لیجیے کام شرُوع ہو گیا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی پالی مقرّر کر لی اور زور شور سے کٹائی کرنے لگا۔ بھرائی ایک طرف کھڑا ڈھول بجا رہا ہے۔ جب بھی وہ ڈھول کی تال بدلتا ہے،

جوانوں میں جوش کی ایک نئی لہر اُبھر آتی ہے اور اُن کے خُون میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ درانتیاں تیز۔ اور تیز۔ اور تیز چلنے لگتی ہیں۔



نوجوانوں کو اپنی جوانی پر ناز ہے۔ ادھیڑ عمر لوگوں کو اپنی عزّت کا خیال ہے۔ سب ایک دُوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کِسی سے پیچھے رہ جانا اُن کی شان کے خلاف ہے۔ ڈھول کی ولولہ انگیز تال، بزُرگوں کی "ہلاشیری" اور ساتھیوں سے مقابلے کا خیال، ان کی طاقت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ کرتا ہے۔ سارا دن یہی ولولہ اور جوش رہے گا۔ اُدھر ایک ٹولی پُولے باندھنے کا کام کر رہی ہے۔ فصل کاٹنے کے ساتھ ساتھ اس کا سمیٹنا بھی ضرُوری ہے۔ چند بہادر جوان پُولوں کے گٹھے اُٹھا اُٹھا کر ڈھیریاں جما رہے ہیں۔ یہاں پڑے پڑے یہ سُوکھ جائیں گے تو کھلیان تیّار ہوگا اور گندم گاہنے کا کام شرُوع ہو جائے گا۔

اِس موقعے پر بچّے بھی کِسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ کچھ تو ڈھول کی گت پر ناچ گا رہے ہیں۔ اِن کی خوش آوازی کام کرنے والوں کو لُطف اندوز کرتی ہے۔ کچھ بچّے پانی

لانے اور پلانے کا کام انجام دے رہے ہیں اور کچھ پُولے باندھنے والوں کی مدد کر رہے ہیں۔ چند دلاور لڑکے ایسے بھی ہیں جو درانتیاں سنبھال کر جوانوں کے ساتھ کٹائی کرنے لگ گئے ہیں۔ کیوں نہ ہو، آخر کل انھی کو جوان ہو کر یہ سب کام سنبھالنا ہے۔ آج سیکھیں گے تو کل کریں گے۔

دیہاتی عورتیں بھی مَردوں کے برابر کام کرتی ہیں۔ کچھ تو گاؤں ہی میں "ونگار" والوں کے لیے کھانا تیار کرنے میں مصرُوف ہیں۔ کچھ کھیتوں پر آپہنچی ہیں۔ پودے کٹتے وقت سِٹّے ٹُوٹ ٹُوٹ کر گرتے رہتے ہیں۔ پُولے اُٹھنے کے بعد عورتیں گرے ہُوئے سِٹّے چُن چُن کر سمیٹتی جاتی ہیں۔ یہ نہ کریں تو بہت سا غلّہ ضائع ہو جائے۔ اتنی محنت سے حاصل ہونے والا کوئی دانہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

مشق

1- گندم کی کٹائی کس موسم میں ہوتی ہے؟

2- دیہات میں عام طور پر کٹائی کا طریقہ کیا ہے؟

3- گندم کی کٹائی کا سماں اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

4- آپ نے جو میلا دیکھا ہو، اُس کا حال کہانی کی صُورت میں لکھیے۔

5- ان الفاظ کے معنی لُغت میں دیکھیے اور جملوں میں اِستعمال کیجیے۔

مشقّت طلب۔ شرابور۔ پوشیدہ۔ ثمرہ۔ اُمنگ۔ چوپال۔ گزند۔

6- اُستاد سے پُوچھ کر دیسی مہینوں کے نام یاد کیجیے (جیسے چیت، بیساکھ ......)

7- دھونکنی۔ ہتھوڑا وغیرہ لوہاروں کے اوزار ہیں۔ اِسی طرح کچھ مختلف پیشہ وروں کے ہتھیاروں کے نام لکھیے۔

فالتو کون؟



کٹو ایک موٹی سی لال مُرغی کا نام تھا۔ وُہ ایک مغرُور مُرغی تھی۔ اپنے سِوا کِسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی اور جب وُہ انڈا دیتی، پھر تو اس کے مزاج ہی نہ ملتے۔ کٹاک کٹاک کرتے گھر سَر پر اُٹھا لیتی کہ لوگو دیکھو مَیں نے انڈا دیا۔ گھر میں لوگ ہی کتنے تھے۔ رحمت جولاہا اور اُس کی بُوڑھی بیوی۔ رحمت جوان تھا تو اُس کے بنائے ہُوئے تھان بازار میں ہاتھوں ہاتھ بِک جاتے تھے پر اب وُہ بُوڑھا ہو گیا تھا۔ اُس نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ شہر میں کپڑے کی مِلّیں کھُل گئیں تو اس کے دونوں بیٹے شہر جاکر کام کرنے لگے۔ اِتنے بڑے گھر میں میاں بیوی کا دل نہ لگتا تھا۔ بستی سے کچھ فاصلے پر رحمت کی بیگھا بھر زمین تھی۔ اسی پر اُس نے چھوٹا سا گھر بنا لیا۔ بستی والا گھر بیچ کر ایک ریڑھی اور ایک گھوڑا خرید لیا۔ چندو خُوبصُورت اور چُست گھوڑا تھا۔ اس کے ماتھے پر سفید چاند بنا تھا۔ اِسی لیے رحمت اس کو چندُو کے نام سے پکارتا تھا۔

اسی گھوڑا گاڑی پر رحمت کی گُزر بسر ہونے لگی۔ چندُو گھر میں آیا تو کٹو بیگم کو کچھ اچھا نہ لگا۔ پہلے تو رحمت اور اُس کی بیوی سارا دن کٹو ہی کے آگے پیچھے رہتے تھے۔ اَب بڑے میاں کو ہر وقت چندُو ہی کی فکر لگی رہتی تھی۔ کبھی ٹوکا مشین پر کھڑے ہو کر اُس کے لیے چارا کاٹ رہے ہیں۔ کبھی چنے بھگو رہے ہیں۔ صُبح شام کھریرا لے کر اُس کا بدن صاف کرتے اور

کنویں سے ڈول نکال نکال کر چندُو کو نہلاتے۔

کٹو بیگم دل ہی دل میں سخت ناراض ہُوئی۔ اے لو! مَیں تو ہر روز یہ بڑا سا انڈا ان کو دیتی ہوں اور بڑے میاں ہیں کہ چندُو کے آگے پیچھے پھرا کرتے ہیں اور یہ بڑی بی بھی تو بس ایسی ہی ہیں۔ جب دیکھو اوکھل میں چنے ڈالے چندُو کے لیے کُوٹے جا رہے ہیں۔

ایک دن بڑے میاں بستی سے واپس آئے تو اُن کے ساتھ ایک چھوٹا سا کُتا ڈبُو بھی تھا۔ کہنے کو تو ڈبُو میاں چندُو کی اور گھر کی چوکیداری کے لیے لائے گئے تھے، مگر بڑے میاں اور بڑی بی کی آنکھ کا تارا بن بیٹھے تھے۔ جب دیکھو دُودھ ٹھنڈا کر کے پیالے میں ڈال کر سامنے رکھا جا رہا ہے۔ کبھی گوشت اُبال کر آگے رکھا جا رہا ہے۔ ڈبُو میاں بھی رحمت کے ساتھ لگے پھرتے۔ دُم ہلاتے اندر باہر پھرتے تو کٹو بیگم جل کر خاک ہو جاتی۔ آخر کو ایک دن اُس نے غصّے میں آ کر ہڑتال کر دی۔

پھُول سُوج کر دڑبے میں بیٹھ گئی۔ انڈا دینا بند کر دیا۔ کوئی ہاتھ لگانے کی کوشش کرتا تو اور بھی پَر پھُلا لیتی اور رُوٹھی رُوٹھی آوازیں نکالنا شرُوع کر دیتی۔ بڑی بی نے ایک شور مچا دیا۔ اے لو ہماری کٹو تو کڑک ہو گئی۔

کٹو بیگم دِل ہی دِل میں خُوب ہنسیں۔ کٹو بیگم سمجھتی تھی کہ ان کے سوا دُنیا کے تمام جانور فالتو ہیں، لیکن کٹو بیگم کو یہ پتا نہ تھا کہ رحمت کو بھی ہر طرح سے کام نکالنا آتا ہے۔ ایک روز رحمت نے ایک درجن انڈے لا کر کٹو بیگم کے نیچے رکھ دیے اور کہنے لگا "لو کٹو بیگم! اَب تُم انڈوں پر بیٹھو۔ ہاں بھئی فالتو بیٹھ کر کھانا بہت بُری بات ہے۔"

اگلے روز رحمت کو کسی سبزی والے کے ساتھ مال لے کر دُوسری بستی جانا تھا۔ وہاں سے واپسی پر بڑے میاں ایک سفید بطخ لے آئے۔ اِس بطخ کا نام اُنھوں نے بطو بیگم رکھ دیا۔ بطو بیگم کو پانی بہت پسند تھا۔ سارا دِن کیچڑ میں چھپ چھپ

کرتی پھرتی۔ تب ایک دن بڑے میاں اور بڑی بی نے مل کر کنویں کے قریب ایک صاف ستھرا پکا حوض بنایا اور اس میں پانی بھر کر بطو بیگم کو چھوڑ دیا۔

بطو بیگم مزے سے حوض میں تیرا کرتی اور ایک انڈا روز دیتی۔ کٹو بیگم نے جو دیکھا کہ اب بڑے میاں بطو بیگم سے ایک انڈا روز وصول کر رہے ہیں تو پھول سوج کر اور بھی کپا ہو گئی۔ خیر اس کے اکیس دن پورے ہو چکے تھے۔ ایک صبح جو کٹو بیگم جاگی تو مخمل کی طرح درجن بھر نرم نرم چوزے اس کے گرد چوں چوں کر رہے تھے۔ بڑی بی نے کٹو بیگم کو دانہ ڈالنے کے لیے دڑبہ جو کھولا تو خوشی کے مارے چیخیں نکل گئیں۔ لگیں بڑے میاں کو آواز دینے۔



اُرے میاں! اے میاں! دیکھو تو ہماری کٹو نے چوزے نکالے۔ ایک انڈا بھی تو خراب نہیں ہوا۔ پورے بارہ چوزے نکل آئے۔"

اب تو کٹو بیگم کے غرور کا ٹھکانا نہ تھا۔ ہر وقت پھولی پھولی چوزوں کو پروں میں لیے پھرتی اور بطو کے حوض کے قریب جا کر بڑے غرور سے کہتی "اے! کیا تم ایک انڈا دے کر اتراتی ہو۔ مجھے دیکھو! گھر بھر دیا ہے مخمل کے سے زرد زرد چوزوں سے۔"

سفید پروں اور چوڑی سی پیلی چونچ والی بطو قیں قیں کر کے ہنس پڑتی۔ کٹو بیگم کٹ کٹ کر کے شیخیاں بگھارے جاتی "اِس گھر میں تو سب ہی فالتو ہیں میرے

سوا۔ ارے یہ ڈبو نگوڑا تو بالکل ہی فالتو ہے اور اس چندو کو تو کوئی دیکھے ، کیسا اِٹھلا اِٹھلا کر چلتا ہے۔"

ایک دوپہر کو کٹو پر پھیلائے دُم اُٹھائے اپنے چوزوں کو دانہ دُنکا چُگنا سکھا رہی تھی کہ ایک بلی جو دیر سے گھات لگائے بیٹھی تھی، اُن پر جھپٹی۔ دڑبے کے پاس ہی ڈبو بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ کٹو بیگم بلی کو دیکھ کر چیخ پڑی ۔کٹ کٹ کٹاک ۔ جیسے کہتی ہو بچاؤ ۔ بچاؤ، میرے چوزوں کو بچاؤ۔ ایک پل میں ڈبو لپکا اور غرّا کر بلی کو گھورا۔ ڈبو کو دیکھ کر بلی کی جان





ہی تو نکل گئی، دُم دبا کر بھاگی۔ ڈبو اِس وقت تک بھونکے گیا جب تک کہ بڑی بی نے آکر چوزوں کو ٹاپے کے نیچے بند نہ کر دیا۔ کٹو بیگم تھر تھر کانپتی بطو کے پاس پہنچی اور اپنی زبان میں بولی "اری بہن! یہ ڈبو تو بڑے کام کا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو آج میرے بچوں کی جان بچنی مشکل

تھی"۔ بطو قَیں قَیں کر کے ہنسی اور پھر بولی" ہاں دیکھ لو! دُنیا میں فالتو کوئی نہیں ہوتا"۔ مگر ابھی یہ بات کٹو کی سمجھ میں پُوری طرح نہ آئی تھی، جھٹ بولی، "پر یہ چندُو نکوڑا تو فالتو ہی ہے۔"

بطو قَیں قَیں کر کے ہنسی اور اُس نے پانی میں ڈُبکی لگا لی۔

ایک صبح رحمت نے تھان پہ دیکھا تو چندُو اُونگھ رہا تھا۔ شام کو جو دانہ دیا تھا وُہ یُونہی پڑا تھا۔ چندُو بہت بیمار ہو گیا تھا۔

بڑے میاں گھبرا گئے۔ چندُو ہی تو اُن کی روزی کا سہارا تھا۔ پاس والے قصبے میں مویشیوں کا شفا خانہ تھا۔ چندُو کو وہاں لے گئے۔ کٹو دِن میں کئی مرتبہ جا کر چندُو کے دانے پر چونچ مارتی تھی، مگر آج نہ چندُو تھا نہ اُس کا دانہ۔ اُس کا سُونا تھان بہت بُرا لگ رہا تھا۔

ہفتہ بھر چندُو شفا خانے میں رہا اور اِسی وجہ سے رحمت کو کوئی مزدُوری نہ مِل سکی۔ مہینے کے آخری دِن تھے۔ گھر میں ایک پیسا بھی نہ تھا۔ کٹو کا دانہ بھی نہ آسکا تھا اور اُس کے بچّے بہت بھُوکے ہُوئے تو بڑی بی کے پاس جا کر کٹ کٹ کرنے لگے۔

بڑی بی کہنے لگیں۔ "ارے مَیں تم کو دانہ کہاں سے دُوں؟ گھر میں کیا رکھّا ہے، دُعا کرو چندُو اچھّا ہو کر آئے، بڑے میاں کو کام ملے تو گھر بھر کے پیٹ میں روٹی پڑے۔" کٹو بیگم اپنے بچّوں کو لیے دڑبے میں جا کر بیٹھی اور اس رات کٹو نے دُعا مانگی۔ "اللہ میاں چندُو کو اچھّا کر دو۔ چندُو تو بڑے کام کا ہے۔ اللہ میاں میری توبہ ہے۔ اَب مَیں چندُو کو کبھی فالتو نہیں کہُوں گی۔"

دُوسری صبح کٹو بیگم اپنے بچّے لے کر نکلی تو دیکھا بڑے میاں چندُو کو ریڑھی میں جوت رہے ہیں۔ اس شام بڑے میاں واپسی میں بہت سا سامان لائے جس میں

کٹو کا دانہ بھی تھا اور پھر کٹو نے دانے پر چونچ مارتے مارتے سوچا "بطو بیگم سچ ہی تو کہتی ہے کہ دُنیا میں کوئی بھی فالتو نہیں۔"

مشق

1- (i) کٹو بیگم، ڈبُو اور چندُو سے کیوں جلتی تھی؟
(ii) ڈبُو نے کٹو کے بچّوں کی جان کس طرح بچائی؟
(iii) چندُو کے بیمار ہو جانے سے گھر بار کی کیا حالت ہو گئی؟
(iv) اِس سَبق سے آپ کیا نصیحت حاصِل کر سکتے ہیں؟

2- مزاج۔ خاطر۔ عَادت اور فالتو کا تلفُّظ اِعراب لگا کر واضح کیجیے۔

3- گزُر بَسر کرنا۔ جل کر خاک ہو جانا۔ فالتو۔ دڑبہ کو اپنے جُملوں میں اِستعمال کیجیے۔

4- میں ۔ سے ۔ پر ۔ تک وغیرہ حرُوف ہیں۔ اِس سبق میں سے دس حرُوف چُن کر الگ کیجیے۔

رُت بدل گئی

جولائی کا مہینا تھا۔ گرمی شدّت سے پڑ رہی تھی۔ گلیوں میں دوپہر ہی سے سنّاٹا چھا جاتا تھا۔ ہر طرف زرد زرد پتّے اُڑتے تھے۔ درختوں کی ہریالی دُھول میں دَب گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پودے پیاسے اور مُرجھائے کھڑے تھے۔ یکایک آندھی کے جھکّڑ چلتے تو آسمان سے بھُوبل سی برسنے لگتی۔ باغوں میں کوئل کُوکتی تو یُوں لگتا جیسے پانی مانگ رہی ہو۔ کئی دن سے آسمان پر سفید اور بھُوری بدلیاں اُٹھتیں لیکن آندھی کے جھکّڑوں کے ساتھ اُڑتی چلی جاتیں۔

اِس دن بھی صُبح سویرے آسمان پر بدلیاں آئیں، لیکن گرم ہَوا کے جھکّڑوں کے ساتھ اُڑتی چلی گئیں۔ غضب کی گرمی تھی۔ ماؤں نے بچّوں کو زبردستی گھروں میں بند کر رکھّا تھا کہ باہر نکلیں گے تو لُو لگ جائے گی۔ اظہر سب کی نظر بچا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ شہزاد بھی اپنی کھڑکی کی سلاخیں پکڑے گلی میں جھانک رہا تھا۔ اظہر کو دیکھ کر وُہ بھی باہر نکل آیا۔ اب دونوں لڑکے گلی میں کھڑے تھے۔ گلی سنسان تھی۔ ایک پیاسا کوّا دیوار پر بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ گلی کے نُکّڑ پر ایک کُتّا زبان باہر نکالے بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

شہزاد بولا: "کیا انسان کیا جانور گرمی نے سبھی کو پریشان کر رکھا ہے۔ دیکھو تو یہ کُتّا کیسے ہانپ رہا ہے!" اظہر نے کہا: "مجھے تو سب سے زیادہ رحم درختوں اور پودوں پر آتا ہے۔ گرمی سے کُملائے رہتے ہیں۔ اُف تو یہ! ہَوا کتنی گرم چل رہی ہے۔ ناحق ہی باہر نکلے!"

شہزاد نے کہا: "بھئی گھر میں بیٹھے بیٹھے بھی تو دِل گھبرا جاتا ہے۔ چھٹیاں آتی

ہیں تو ساتھ گرمی بھی لاتی ہیں۔ آؤ چلو، ہم دینو بابا کے گھر چلتے ہیں۔"

دینو سقّہ اپنی صاف سُتھری جھونپڑی میں رہتا تھا۔ بڑا محنتی تھا۔ اِس بڑھاپے میں بھی بڑا مُستعِد تھا۔ جن گھروں میں نل نہیں لگا تھا، وہاں بڑی پابندی سے پانی پہنچاتا تھا۔ دونوں بچّے دروازے پر پہنچے۔ دینو کے چھپّر پر ترئی کی بیل پھیلی ہُوئی تھی۔ اگرچہ دینو اِس کو برابر پانی دیتا تھا، پھر بھی وُہ کُملائی ہُوئی اور گرد میں اَٹی پڑی تھی۔ اُنھوں نے جھانک کر دیکھا، بُوڑھا دینو بیٹھا اپنی مشک ٹھیک کر رہا تھا۔ اُس نے چار خانے کا تہمد باندھ رکھّا تھا۔ اس کی بُنیان جگہ جگہ سے پھٹی ہُوئی مگر صاف سُتھری تھی۔ جھرّیوں بھرے چہرے سے پسینہ بَہ رہا تھا، لیکن اپنے کام میں مصرُوف تھا۔ شہزاد کہنے لگا:" دینو بابا اِتنی گرمی میں بھی اپنے کام سے لگے رہتے ہیں۔"

دروازے پر آہٹ سُن کر دینو نے سَر اُوپر اُٹھایا۔ اظہر اور شہزاد کو دروازے پر کھڑے دیکھ کر پیار سے کہا: "آؤ بیٹا! اندر آجاؤ۔" دونوں لڑکے اندر چلے گئے۔ دینو کا صاف سُتھرا چھپّر ٹھنڈا ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ صحن میں ایک پیاسی چڑیا پانی کی تلاش میں پُھر پُھر اُڑتی پھر رہی تھی۔ دینو نے اُٹھ کر صحن میں رکھّے ہُوئے مٹّی کے ایک کُونڈے میں ٹھنڈا پانی بھر دیا اور تھوڑے سے چاول وہاں بکھیر دیے۔ چھپّر پر بیٹھی پیاسی چڑیاں چُوں چُوں کرتی کُونڈے پر آبیٹھیں۔ دینو بابا پھر کام میں مصرُوف ہوگیا۔

شہزاد بولا:" بابا اِتنی گرمی میں بھی آپ کام کر رہے ہیں؟" دینو نے جواب دیا گرمی تو سب کو لگتی ہے بیٹا! پر گرمی سے دُنیا کے کام تو نہیں رُک جاتے۔ مَیں تو کہوں، آج ضرُور بارش ہوگی۔" اظہر نے پُوچھا "بابا! لوگوں کو کیسے پتا لگ جاتا ہے کہ آج بارش ضرُور ہوگی؟" دینو بابا مُسکرائے "یہ تو صاف ظاہر ہے، کل سے بھُوری بھُوری بدلیاں آتی اور چلی جاتی ہیں۔ مَیں تو جانوں، آج پانی برسے پر برسے۔" ابھی دینو بابا یہ کَہ ہی رہے تھے کہ آسمان پر گھٹائیں جھُومنے لگیں۔ دوپہر شام کے جھُٹ پٹے میں

بدل گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ دینو نے مغرب کی طرف اشارہ کیا۔ "دیکھو! یہ گھٹا پچھم سے اُٹھی ہے۔ ضرور برسے گی"۔ ایک دم بڑے زور کی گرج ہوئی، بجلی چمکی اور کالے کالے بادلوں کے دامن میں سونا سا دمکنے لگا۔ اظہر کے مُنہ سے نکلا "اُفوّہ کتنا پیارا سماں ہے"۔ اس کے یہ کہتے کہتے بارش آگئی اور دیکھتے دیکھتے جَل تھَل ایک ہو گئے۔ بھیگی بھیگی ہَوا کے نرم جھونکے ان کے گالوں کو سہلا رہے تھے۔ ہر چیز پانی سے دُھل کر نکھر آئی۔ بابا کے چھپّر پر پھیلی ہُوئی بیل نہا دھو کر ایسی نکل آئی تھی کہ سارا چھپّر سَجا سَجا نظر آ رہا تھا۔

سُونی گلیوں میں بارش کے پہلے ہی جھالے سے رونق آگئی تھی۔ گھروں میں دبکے ہُوئے بچّے، بُوڑھے جو گرمی سے اوسان کھو بیٹھے تھے، باہر نکل پڑے اور اب بارش میں نہا کر جسموں کی گرمی باہر نکال رہے تھے۔ بچّے ایک دُوسرے پر پانی اُچھال اُچھال کر بارش کا پہلا دن منا رہے تھے۔ گھروں کے پرنالے زور شور سے چل رہے تھے۔ ٹپ اٹپ! بابا کا چھپّر جگہ جگہ سے ٹپک پڑا۔ اظہر بولا "لو اور مصیبت، اب لوگوں کی چھتیں بھی ٹپکیں گی"۔

دینو بابا اطمینان سے اُٹھے۔ جہاں جہاں چھپّر ٹپک رہا تھا، کہیں لگن اور بالٹی لگائی، کہیں لوٹا رکھّا، پھر وُہ لڑکوں سے بولے: "ارے بیٹا! چھتیں ٹپکیں گی تو اللہ ہاتھ پاؤں سلامت رکھّے، ذرا دیر میں مرمّت کر لیں گے۔ اب دیکھو کیسی رُت بدلی ہے۔ تپتی بُھنتی مخلوق چَین کا سانس تو لے گی"۔ اب بارش کا زور گھٹ گیا تھا۔ بھینی بھینی پھوہار پڑ رہی تھی۔ پکوان کی سوندھی سوندھی خُوشبُوئیں فضا میں پھیل رہی تھیں۔ دینو بابا بولے: "لو بچّو! مبارک ہو۔ آج ساون کی پہلی بارش ہو گئی۔ اب باغوں میں جھُولے پڑیں گے۔ آموں میں رس پڑے گا۔ لڑکے بالے ساون منائیں گے۔ کوئی دریا کا رُخ کرے گا، کوئی نہر پر جائے گا۔ لدی پھندی سواریاں باغوں اور سیر گاہوں کی طرف دَوڑیں گی کہ بارش سے نہائی دھوئی ہری بھری فضا میں سُکھ کا سانس لے سکیں"۔

دینو بابا کی مشک کی مرمّت ہو چکی تھی۔ اُنھوں نے مشک ایک طرف رکھتے ہُوئے کہا: "واہ میرے مولا! پل بھر میں کیسی رُت بدل گئی"!

مشق

1- بارش سے پہلے کی حالت بیان کیجیے۔

2- بارش کا سماں اپنے لفظوں میں لکھیے۔

3- بابا دینو کیسا آدمی تھا؟

4- سنّاٹا۔ ہریالی۔ آہٹ۔ چَین کا سانس لینا۔ اطمینان کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

5- پچھم۔ پُورب۔ اُتّر۔ دکّھن کون کون سی چار سمتوں کے نام ہیں۔

6- اِس سبق میں سے دس ایسے فعل چُن کر لکھیے جن میں گزُرا ہُوا زمانہ پایا جائے۔ مثلاً گیا تھا، آیا وغیرہ

7- نیچے دیے ہُوئے ہر لفظ کے سامنے ایسا لفظ لکھیے جو اُس کے اُلٹ معنی دیتا ہو۔ جیسے بڑا کا اُلٹ چھوٹا۔

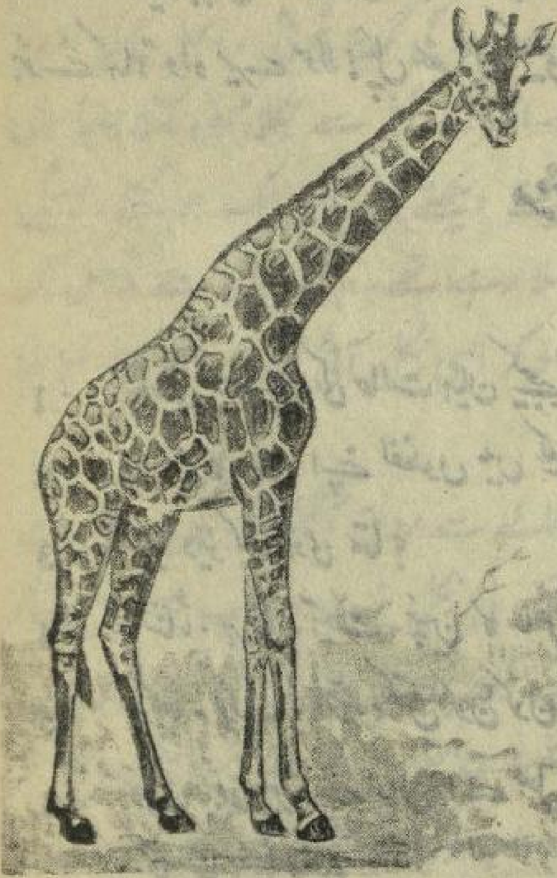
اُونچا ________

گندا ________

سُوکھا ________

کھٹّا ________

شریف جانور



ایک آدمی کو افریقہ جانے کا اتّفاق ہُوا۔ وہاں اُس نے طرح طرح کے جنگلی جانور دیکھے۔ ایک جانور اُس نے ایسا دیکھا جو سب سے نرالا تھا۔ اُس جیسا کوئی جانور اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

جب وُہ آدمی اپنے وطن واپس آیا تو اُس نے اپنے دوستوں کو سفر کے حالات سُنائے۔ اُس نے افریقہ کے جانوروں کا بھی ذِکر کیا۔ جب اُس عجیب جانور کا ذِکر آیا تو دوستوں نے دریافت کیا کہ وُہ جانور ہے کِس طرح کا؟ وُہ بولا: "اُس جانور کا جسم اُونٹ کی طرح تھا، اُس کا سَر بارہ سِنگھے جیسا، اُس کے سینگ ہرنوٹے کی مانند، اُس کی کھال تیندوے کی سی اور اُس کے کھُر بَیل سے مِلتے جُلتے تھے"۔

افریقہ کے اِس عجیب جانور کا نام زرافہ ہے، جو دُودھ دینے والے جانوروں میں سب سے دراز قد جانور ہے۔ اُس کا قد چھ سات میٹر تک ہوتا ہے۔ اُس کا ننّھا مُنّا بچّہ بھی پیدائش کے وقت کوئی ڈیڑھ میٹر کا ہوتا ہے۔ دُور سے دیکھو تو بس اُونٹ ہی کی طرح نظر آتا ہے۔ زرافے کے جسم پر بڑے بڑے دھبّے ہوتے ہیں۔ اِس کے کھُر بَیل کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ گائے بھینس کی طرح جُگالی کرتا ہے۔ اِس کے سر

پر سینگ بھی ہوتے ہیں لیکن یہ سینگ لڑنے کے لیے نہیں۔ سینگوں والے دُوسرے سب جانور سینگوں سے ہتھیار کا کام لیتے ہیں اور دُشمن کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن زرافے کے سینگ بس دِکھاوے ہی کے سینگ ہیں۔ وُہ اِن سے لڑائی میں کوئی مدد نہیں لیتا، اور پھر وُہ غریب لڑتا ہی کب ہے؟ وُہ تو صُلح جُو اور امن پسند جانور ہے۔ اِسی لیے شریف جانور کہلاتا ہے۔ ہاں! اگر کوئی دُوسرا اِس پر حملہ کر دے تو اپنے بچاؤ کے لیے اپنی مضبُوط ٹانگوں سے ہتھیار کا کام لیتا ہے۔ وُہ دُشمن کو زور سے ٹھوکر مارتا ہے، لیکن عام طور پر بیچارے کا نشانہ خطا ہی جاتا ہے۔

زرافہ صحرائی اور جنگلی جانوروں کا شریف دوست ہے۔ ہرن اور شُتر مُرغ وغیرہ بے خوف اِس کے پاس آجاتے ہیں۔ جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے جانوروں پر شکاریوں اور درندوں کا خوف طاری رہتا ہے۔ وُہ بیچارے ڈر کے مارے اطمینان سے پانی نہیں پی سکتے۔ لیکن زرافے کی موجُودگی میں اُن کا خوف دُور ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر زرافہ گردن اُٹھائے دُور دُور تک نظر دَوڑاتا رہتا ہے۔ اِس کی نظر بہت تیز ہے۔ ذرا خطرہ محسُوس ہوتا ہے تو سب کو چوکنّا کر دیتا ہے۔ اِس کی دوستی جانوروں کو تحفُّظ کا احساس دلاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شکاری زرافے سے ناراض رہتے ہیں۔ زرافے گروہ بن کر چرنے کو نکلتے ہیں۔ اِن میں سے ایک زرافہ چوکیداری کا فرض انجام دیتا ہے، باقی ساتھی اطمینان سے اپنا پیٹ بھرتے رہتے ہیں۔ جب بھی خطرہ محسُوس ہوتا ہے، چوکیدار زرافہ اپنی کنوتیاں کھڑی کر لیتا ہے اور دُم ہلاتا ہے۔ بس پھر کیا ہے، سارا گروہ چونک اُٹھتا ہے۔ سب کے سب گردنیں لہراتے، دُمیں ہلاتے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اِس وقت اِن کی رفتار پچاس کلومیٹر فی گھنٹا تک ہوتی ہے۔ بچّوں کی حفاظت کا کام بھی ان کے ہاں اِمدادِ باہمی کے طریقے پر ہوتا ہے۔ مائیں اپنے بچّوں کو ساتھ لے کر باہر نکلتی ہیں تو ایک ماں سب بچّوں کی نگراں

بن جاتی ہے۔ باقی مائیں بچّوں سے بے پروا ہو کر چرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ نگران ماں بچّوں کو کھیلتے کُودتے ہُوئے دیکھتی رہتی ہے۔ لیکن جُونہی کوئی شرارتی بچّہ اپنی حد سے باہر نکلتا ہے وُہ بھاگ کر جاتی ہے اور اُسے واپس لے کر آتی ہے۔

زرافوں کے کھانے کا انداز بھی انوکھا ہے۔ زرافہ گھاس نہیں چرتا بلکہ اُونچے اُونچے درختوں کے پتّوں اور ٹہنیوں کو نوالہ بناتا ہے۔ اس اُونچے قد پہ اُس کی لمبی لمبی گردن، اس پہ لمبی تھوتھنی اور کوئی آدھ میٹر کی زبان! یہ زبان زرافے کی بہت مدد کرتی ہے۔ اُونچی اُونچی شاخوں کے پتّے لپیٹ لپاٹ کر مُنہ تک لے آتا ہے۔ زرافہ درختوں کی ٹہنیوں میں گردن ڈالے اِس طرح کھڑا ہو جاتا ہے گویا درخت سے گلے مِل رہا ہے۔ دُور سے تو پتا بھی نہیں چلتا کہ یہ درخت ہے یا جانور۔ زرافے کے سونے کا طریقہ بھی سب سے جُدا ہے۔ اِس کے بچّے کبھی زمین پر لوٹ مار لیں تو اور بات ہے ورنہ زرافہ کھڑے کھڑے درخت کے ساتھ گردن لگا کر نیند کے مزے لُوٹتا ہے۔

ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ زرافے کو اپنے کھانے کی فکر تو رہتی ہے لیکن پانی پینے کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ کبھی مِل گیا تو دو چار گھُونٹ پی لیا ورنہ کئی کئی مہینے پانی پیے بغیر گُزر جاتے ہیں۔ ایک سبب یہ بھی تو ہے کہ پانی پینا زرافے کے لیے مصیبت سے کم نہیں۔ یہی لمبی گردن اور اُونچی ٹانگیں اِس کے لیے پانی پیتے وقت عذاب بن جاتی ہیں۔ زرافے کو پانی پیتے دیکھنا بھی ایک دلچسپ منظر سے لُطف اندوز ہونے کے برابر ہے۔ اگلی ٹانگیں پھیلا کر، وزن پچھلی ٹانگوں پر ڈال لیتا ہے اور گردن کو جھٹکے دے دے کر رفتہ رفتہ پانی تک مُنہ کو لاتا ہے۔ بے چارے کی گردن نیچے نہیں جُھک سکتی۔ بیس بیس منٹ اِسی مشقّت میں گُزر جاتے ہیں۔ دو چار گھُونٹ لینے کے بعد ایک جھٹکے سے گردن واپس لاتا ہے اور سیدھا کھڑا ہو کر دم لیتا ہے۔ پھر ذرا ہمّت کر کے دو گھُونٹ پانی پینے کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ اِس مشقّت سے تو واقعی پیاسا

رہنا بہتر ہے۔

آپ اگر چڑیا گھر جائیں تو وہاں زرافے سے ملنے کے لیے ضرور جائیں۔ آپ جلد ہی اس کے دوست بن جائیں گے۔ اگر آپ اُس کے لیے کوئی تحفہ لے گئے تو وُہ بڑے پیار سے تحفہ وصول کرے گا اور محبّت بھری خاموش نظروں سے آپ کا شکریہ ادا کرے گا۔ امن پسندی، صُلح جوئی اور خاموشی زرافے کی زندگی کے اُصول ہیں۔ وُہ دوست سب کا ہے، دُشمن کسی کا نہیں۔

مشق

1۔ زرافے کو شریف جانور کیوں کہا گیا ہے؟

2۔ زرافہ نرالا جانور کس لحاظ سے ہے؟

3۔ زرافے کے پانی پینے کی حالت بیان کیجیے۔

4۔ زرافے اِمداد باہمی کے طریقے پر کیسے عمل کرتے ہیں؟

5۔ نرالا۔ دراز قد۔ صُلح جُو۔ نشانہ خطا ہونا۔ تحفّظ۔ خوف طاری ہونا۔ امداد باہمی۔ عذاب۔ لُطف اندوز کے معنی لکھیے اور جُملوں میں اِستعمال کیجیے۔

6۔ زرافے کی تصویر بنا کر اُس میں موزوں رنگ بھریئے۔

7۔ ذیل کی عبارت کو دوبارہ لکھیے اور اس میں حمید کی جگہ وُہ ۔ میں ۔ اُس ۔ تُم کا استعمال درست طریقے سے کیجیے:۔

"حمید دیر سے مدرسے پہنچا۔ حمید کے اُستاد نے حمید سے پُوچھا کہ حمید دیر سے کیوں آئے ہو۔ حمید بولا۔ جی! حمید دیر سے جاگا تھا۔ حمید نے بڑی کوشش کی لیکن وقت پر نہ پہنچ سکا۔ حمید کے اُستاد نے سچ بولنے پر حمید کو شاباش دی"۔

(حمید کی جگہ جو الفاظ اِستعمال کیے جائیں گے۔ ان کو ضمیر کہتے ہیں یعنی وُہ۔ اُس۔ تُم۔ مَیں وغیرہ)

کے۔ٹُو

طارق ہر روز صُبح اخبار پڑھتا ہے۔ ایک دن اُس نے یہ خبر پڑھی کہ کوہ پیماؤں کی ایک جماعت کے۔ٹُو سَر کرنے کے لیے پاکستان پہنچ گئی ہے۔ اخبار میں ان کوہ پیماؤں کی تصویریں بھی تھیں۔ طارق کی سمجھ میں کچھُ نہ آیا کہ کوہ پیما کون ہوتے ہیں اور کے۔ٹُو کِس چیز کا نام ہے۔ اُس نے اپنے بھائی خالد سے پُوچھا "بھائی جان کوہ پیما کِسے کہتے ہیں؟"



خالد: طارق میاں! کوہ پیما اُس شخص کو کہتے ہیں جِسے پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق ہو۔ خاص طور پر وُہ لوگ کوہ پیما کہلاتے ہیں جو اُونچی اُونچی چوٹیوں پر چڑھنے کی کوششیں کرتے ہیں۔

طارق: بھائی جان! انھیں چوٹیوں پر چڑھنے کا شوق کیوں ہوتا ہے؟

خالد: بھئی یہ عجیب سوال ہے۔ اپنے اپنے شوق کی بات ہے۔ جِس طرح ہم شوق کے طور پر بعض مشغلے اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً مجھے باغبانی کا شوق ہے،

یوسف ٹکٹیں جمع کرتا ہے اور تم اخباروں کے کارٹون اکٹھے کیا کرتے ہو، اسی طرح کوہ پیماؤں کا مشغلہ چوٹیوں پر چڑھنا ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہمارے مشغلے آسان ہیں اور کوہ پیمائی بڑی جرأت اور ہمّت کا کام ہے۔ پہاڑوں پر چڑھنا ویسے بھی خاصا مشکل ہے، لیکن چوٹیوں کو سَر کرنا تو جان جوکھوں کا کام ہے۔ اِس شوق میں کتنے ہی لوگوں نے اپنی جانیں قُربان کر دی ہیں۔ دُنیا کی سب سے اُونچی چوٹی مونٹ ایورسٹ ہے۔ اس کو سَر کرنے کے لیے کئی جماعتیں گئیں، جن میں سے بہت سے کوہ پیما جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

طارق: ہاں بھائی جان! پہاڑ پر چڑھنا واقعی مُشکل ہوتا ہے۔ مَیں آپ کے ساتھ کشمیر کے پہاڑوں کی سَیر کے لیے گیا تھا۔ وہاں ایسی ایسی ڈھلانیں تھیں کہ ہر لمحہ یہ خوف ہوتا تھا کہ ذرا پاؤں پھسلا تو سیدھے گہرے کھڈ میں جا گریں گے۔ لیکن بھائی جان! پہاڑوں کا نظارا بڑا پُرلُطف ہوتا ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے۔ کہ بڑے ہو کر کوہ پیما بنوں۔ پہاڑی ندی نالوں کی سَیر کروں۔ برف سے لدی ہُوئی چوٹیوں پر کھڑے ہو کر لُطف اُٹھاؤں۔

خالد: بھیّا! اِس کام کے لیے ہمّت و جرأت کے ساتھ علم کی بھی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ بس اُٹھے اور پہاڑ پر چڑھنا شرُوع کر دیا۔

طارق: کیا مطلب؟

خالد: کوہ پیما کے لیے جغرافیے اور سائنس کا علم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کا مُلکی حالات اور موسمی تبدیلیوں سے واقف ہونا لازمی ہے۔ اِسی طرح اسے سائنس کے اُصولوں کو جاننا چاہیے۔ تم جانتے ہو کہ جُوں جُوں بلندی کی طرف جائیں ہَوا کا دباؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ بہت اُونچی جگہ جا کر تو ہَوا اِتنی ہلکی ہو جاتی ہے کہ سانس لینا مُشکل ہو جاتا ہے۔ اِسی لیے کوہ پیما گیس کے سلنڈر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

طارق: تو کیا ہُوا۔ میں یہ سارے علم حاصل کرنے کے بعد ہی تو کوہ پیمائی شروع کروں گا۔
اب مہربانی کر کے یہ بتا دیجیے کہ "کے۔ٹُو" کیا چیز ہے؟

خالد: "کے۔ٹُو" پاکستان کے شمالی پہاڑوں کی ایک بلند چوٹی کا نام ہے، جو کوہِ قراقرم میں واقع ہے۔ انگریزی حرف 'کے' (K) سے قراقرم مراد ہے اور ٹُو کے معنی ہیں 'دو'۔ اِس کا مطلب ہُوا قراقرم کی چوٹی نمبر دو۔ یہ چوٹی سکردو سے ایک سو پانچ کلومیٹر دُور شمال مشرق کی طرف چین اور پاکستان کی سرحد پر واقع ہے۔
اِس کا اصل نام بلند پہاڑ اور "چگوری" ہے۔

طارق: چگوری کا کیا مطلب ہے؟

خالد: چگوری وہاں کی مقامی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں پہاڑوں کا بادشاہ۔

طارق: بھائی جان یہ چوٹی کتنی اُونچی ہے؟

خالد: یہ تو تم نے سُن رکھّا ہے کہ دُنیا کی سب سے اُونچی چوٹی مونٹ ایورسٹ ہے۔

طارق: جی ہاں! مَیں نے ایک کتاب میں اس کے متعلق پڑھا بھی تھا۔

خالد: بہت خُوب! مونٹ ایورسٹ کے بعد دُنیا کی سب سے اُونچی چوٹی "کے۔ٹُو" ہے۔ اس کی بلندی ساڑھے آٹھ ہزار میٹر کے قریب ہے۔ آسانی کے لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ یہ چوٹی آٹھ کلومیٹر سے کچُھ اُونچی ہے۔

طارق: آٹھ کلومیٹر تو کچُھ زیادہ فاصلہ نہیں۔

خالد: ہاں! اگر سیدھی سڑک سے جانا ہو تو واقعی یہ فاصلہ زیادہ نہیں۔ لیکن پہاڑ کی بلندی کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اُٹھے اور سیدھے سبھاؤ وہاں جا پہنچے۔ پہاڑوں میں راستے بَل کھاتے اُوپر چڑھتے، نیچے اُترتے چلے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کلومیٹر اُوپر چڑھنے کے لیے آٹھ دس کلومیٹر کا چکّر لگانا پڑے۔ مثلاً "کے۔ٹُو" پر پہنچنے کے لیے تقریباً پونے تین سو کلومیٹر سفر طے کرنا پڑتا ہے۔

ایک تو راستے دُشوار گزار ہیں، اس کے ساتھ شدید سردی، برف کے تودے اور طوفانی ہوائیں، کوہ پیماؤں کے لیے طرح طرح کی مصیبتوں کا باعث بن جاتی ہیں۔ جگہ جگہ موت مُنہ کھولے نظر آتی ہے۔ ایسی ایسی جگہیں بھی آتی ہیں کہ کوہ پیماؤں کو ایک ایک قدم رکھنے کے لیے جگہ بنانا پڑتی ہے اور پُورے دن میں بمشکل ایک کلومیٹر کا سفر طے ہو پاتا ہے۔

طارق: بھائی جان! "کے۔ٹو" پر ابھی تک کوئی آدمی نہیں پہنچا؟

خالد: کیوں نہیں۔ یہ چوٹی 1954ء میں سَر ہو چُکی ہے۔ ویسے بڑی مُدّتوں سے اِس کو سَر کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اِس چوٹی پر چڑھنا بہت مُشکل ہے۔ ایک کوہ پیما نے لِکھا تھا کہ اِس چوٹی کو سَر کرنا ناممکن ہے کیونکہ اِس میں ایسی ایسی ڈھلانیں ہیں کہ دِن بھر آپ مشقّت کرتے رہیں تو رات کو اِتنی جگہ بھی نہ بن سکے گی کہ آپ لیٹ کر آرام کر سکیں۔ بہر حال اِس کوشش میں متعدّد جماعتیں آئیں، جِن میں سے کئی لوگ برفانی تودوں اور طوفانوں کی بھینٹ چڑھ گئے، لیکن آخر کار انسان کی ہمّت نے چوٹی کی بلندیوں کو شکست دی۔ ایک اطالوی گروہ نے چوٹی پر فتح کا جھنڈا لہرا دیا۔

مشق

1- کوہ پیمائی کے لیے کون کون سے عِلم حاصل کرنے کی ضرُورت ہوتی ہے؟

2- "چگوری" کے اصل معنی کیا ہیں اور اِس کا دُوسرا نام کیا ہے؟

3- دُنیا کی سب سے اُونچی چوٹی کا نام کیا ہے؟

4- کے۔ٹو کِتنی بُلندی پر واقع ہے اور اسے کب فتح کیا گیا؟

5- کے۔ٹو پر پہنچنے کے لیے کِتنے کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑتا ہے؟

6- اِس سبق کے پہلے تین پیروں میں سے اسم معرفہ فعل اور حرف چُن کر الگ الگ لِکھیے۔

ہم فخرِ جہاں ہیں

ہم فخرِ جہاں ، فخرِ جہاں ، فخرِ جہاں ہیں
ہم ارضِ مقدّس کے جری شیر جواں ہیں
ہم سندھ کے جانباز ہیں سرحد کے جیالے
ہم راوی و مہراں کے کناروں کے اُجالے
ہم طارق و محمُود کی عظمت کے نشاں ہیں
ہم فخرِ جہاں ، فخرِ جہاں ، فخرِ جہاں ہیں
ہر دَور کی تاریخ کے چہرے کی چمک ہم
ہر عہد کے کھلتے ہُوئے پھُولوں کی مہک ہم
تہذیب کا ہم دِل ہیں، تمدّن کی زباں ہیں
ہم فخرِ جہاں ، فخرِ جہاں، فخرِ جہاں ہیں
خالدؓ کا ہم آئین ہیں ، فاروقؓ کا دستوُر
ہر عہد کے بابر ہیں ، ہر اِک دَور کے تیموُر
ہم فاتحِ خیبر کی جلالت کے نشاں ہیں
ہم فخرِ جہاں ، فخرِ جہاں ، فخرِ جہاں ہیں

تاریخ سے پُوچھو کہ وُہ دیتی ہے گواہی
ہم فوجِ محمدؐ کے سپاہی ہیں سپاہی
قُرآن کی آواز ہیں، کعبے کی اذاں ہیں
ہم فخرِ جہاں، فخرِ جہاں، فخرِ جہاں ہیں

(ساقی جاوید)

مشق

1- یہ نغمہ زبانی یاد کیجیے اور گا کر پڑھیے۔
2- اِس سبق میں طارق۔محمُود۔ خالدؓ۔ فاروقؓ۔ بابر۔ تیمُور کے نام آئے ہیں۔ ان کے متعلق مزید معلومات حاصِل کیجیے۔
3- فاتحِ خیبر سے کون مُراد ہیں؟
4- ان مرکبات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے اور اِسی طرح کے پانچ اور مرکبات لکھیے:-
فخرِ جہاں۔ ارضِ مقدس۔

قومی ترانہ

چھُٹی کا دن تھا۔ امجد اپنے کمرے میں بیٹھا مدرسے کا کام کر رہا تھا۔ اِتنے میں اس کے ابّا جان کمرے میں داخل ہُوئے۔ اَمجد نے کھڑے ہو کر ادب سے اُنھیں سلام کیا۔ اُنھوں نے وعلیکم السّلام کہ کر اسے دُعا دی اور پُوچھا:۔

"اَمجد بیٹے! اِس وقت تُم کیا کر رہے ہو؟"

امجد: ابّا جان! ماسٹر صاحب نے فرمایا تھا کہ سب لڑکے اپنی کاپیوں میں قومی ترانہ خُوش خط لِکھ کر لائیں میَں اِس وقت یہی کام کر رہا ہوں۔

ابّا جان: بہت خُوب! لاؤ دیکھیں تمُھارا خط کیسا ہے؟

امجد نے کاپی ابّا جان کو دے دی۔ اُنھوں نے کاپی کو دیکھا بھالا اور کہنے لگے: "مُجھے خُوشی ہے کہ تمُھارا خط اچھّا ہے۔ لیکن خُوش خط لکھنے کے لیے ابھی تمُھیں مزید مشق کی ضُرورت ہے۔ کوشش کرو کہ حروف کے دائروں اور کششوں میں یکسانی رہے۔ یہ دیکھو! یہاں تُم نے 'ض' کا دائرہ بہت چھوٹا بنایا ہے جبکہ اِسی سطر میں 'ن' کا دائرہ بہت بڑا ہو گیا ہے۔ اِسی طرح اس سطر میں پرچم کا 'پر' اور ترقّی کا 'تر' ایک دُوسرے سے مختلف ہیں۔ ذرا سی اِحتیاط کی جائے تو یہ نُقص دُور ہو سکتا ہے۔"

امجد: شکریہ ابّا جان! میں اب پُوری کوشش کروں گا کہ اِس طرح کا کوئی نقص باقی نہ رہے۔

ابّا جان: بیٹا تُم جانتے ہو کہ خُوش خطی کا ایک اہم اصُول کیا ہے؟

امجد: نہیں ابّا جان! مہربانی کر کے آپ بتا دیجیے۔

ابّا جان: فارسی کے ایک شعر میں یہ اصُول بتایا گیا ہے۔ وُہ شعر یہ ہے:

گر تُو می خواہی کہ باشی خُوش نویس
می نویس و می نویس و می نویس

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو چاہتا ہے کہ تُو خُوش نویس بن جائے تو لِکھتا رہ ، لِکھتا رہ ، لِکھتا رہ۔

امجد: ابا جان! ذرا ٹھہریئے! مَیں یہ شعر کاپی میں لِکھ لوں۔

(ابا جان شعر کاپی میں لِکھواتے ہیں۔)

ابّا جان: امجد بیٹے! اس شعر سے مُراد یہ ہے کہ خُوش خطی کے لیے مشق کرنے کی بہت ضُرورت ہے لیکن یہ مشق احتیاط کے ساتھ کی جائے اور خُوش خطی کے اصُولوں پر پُوری طرح عمل کیا جائے۔ اچّھا اب ذرا دیکھیں کہ تمُھیں قومیؔ ترانہ یاد بھی ہے؟

امجد: کیوں نہیں ابا جان! سُنیے۔ لیکن ہاں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ جب قومی ترانہ گایا جا رہا ہو تو ادب کے ساتھ کھڑا ہونا ضُروری ہے۔

ابّا جان: بے شک یہ بات درست ہے۔ تُم ترانہ گاؤ۔ مَیں ادب کے ساتھ کھڑا رہوں گا۔

امجد: پاک سرزمین شاد باد کِشورِ حَسِین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

امجد کے ابّا جان پہلے تو کھڑے سُنتے رہے لیکن جب امجد نے قومی ترانے کا دُوسرا بند پڑھنا شرُوع کیا تو وُہ امجد کے ساتھ مِل کر گانے لگے۔

پاک سَرزمین کا نظام قوّتِ اخُوّتِ عوام
قوم مُلک ، سلطنت پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ ستارہ و ہلال رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی، شانِ حال جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذُوالجلال

صحن میں بچّے کھیل رہے تھے۔ ترانے کی آواز سُن کر وُہ دَوڑے آئے اور ایک قطار میں خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔

امجد اور ابّا جان نے ترانہ ختم کیا تو سب نے سَر جُھکا کر ترانے کی تعظیم کی۔ بچّوں نے خوشی سے تالیاں بجانا شرُوع کر دیں۔ اُنھیں اِس بات پر تعجّب ہُوا کہ ان کے ابّا جان ترانہ بہت اچھّا پڑھتے ہیں۔

اس کے بعد سب مِل کر بیٹھ گئے تو ابّا جان نے بچّوں کو مخاطب کر کے کہا: "تُم میں سے کِس کِس کو ترانہ زبانی یاد ہے؟"

سب نے ہاتھ کھڑے کر دِیے۔ یہ دیکھ کر ابّا جان اور بھی خُوش ہُوئے۔

پھر اُنھوں نے پُوچھا: "تُم نے کبھی سوچا ہے کہ ہمارے قومی ترانے کا مطلب کیا ہے؟" بچّے خاموش رہے۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو ابّا جان کہنے لگے: "اگر تُم چاہو تو مَیں تُمھیں قومی ترانے کا مطلب سمجھا دُوں۔"

سب بچّے: ضرُور ابّا جان ضرُور۔

ابّا جان: یوسف میاں ذرا پہلا بند پڑھیے۔

(یوسف نے پُورا بند سُنا دیا)

ابّا جان: اس بند کا مطلب یہ ہے:

"اے ہماری پاک سرزمین! تُو ہمیشہ خُوش رہے! اے ہمارے خوبصُورت وطن تُو شاد رہے۔ اے پاکستان کی سرزمین! تُو اُونچے اور عالی شان اِرادوں کا نشان ہے۔ تُو ہمارے ایمان اور یقین کا مرکز ہے۔ خُدا تجھے ہمیشہ سلامت اور خُوش رکھے۔"

ابّا جان: اب طارق دُوسرا بند پڑھے گا۔ (طارق دُوسرا بند سُناتا ہے)

ابّا جان: "ہمارے مُلک کی حکومت سب پاکستانیوں کے بھائی چارے اور طاقت کی نشانی ہے۔ خُدا ہماری قوم اور ہمارے مُلک کو ہمیشہ قائم رکھّے۔ یہ مُلک ہمیشہ کامیابی اور ترقّی حاصل کرتا رہے۔"

(تیسرا بند شمیم پڑھ کر سُناتی ہے)

ابّا جان: "اس بند میں پاکستان کے قومی پرچم کا ذِکر کر کے کہا گیا ہے کہ یہ چاند ستارے والا پرچم ہمیں ترقّی اور کمال کا راستہ دکھاتا ہے۔ یہ جھنڈا ہمیں گزرے ہُوئے زمانے کی عزّت اور ترقّی کی یاد دلاتا ہے اور موجُودہ دَور کی شان و شوکت کی نشانی ہے۔ یہ جھنڈا آنے والے زمانے کی جان ہے۔ خُدا اِسے ہمیشہ اُونچا رکھّے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ اس مُلک پر قائم رہے۔"

امجد: ابّا جان اس ترانے میں تو بہت اچھّی اچھّی باتیں بتائی گئی ہیں۔ مَیں اپنی کاپی میں اِس ترانے کے ساتھ اس کا مطلب بھی ضرُور لکھّوں گا اور اب مجُھے ترانہ پڑھنے میں زیادہ لُطف آئے گا۔

ابا جان شاباش بیٹا! جیتے رہو۔ لو، اب تُم اپنا کام کرو۔ میں بھی ذرا بازار تک ہو آؤں۔

مشق

1۔ قومی ترانے کے آداب کاپی میں لکھیے۔

2۔ قومی ترانہ زبانی یاد کر کے جماعت میں مِل کر پڑھیے۔

3۔ قومی ترانے کا مفہوم اچھّی طرح سمجھیے اور اپنے ساتھیوں کو سمجھائیے۔

4۔ امجد کے ابّا جان نے خُوش خطی کے جو اصُول بیان کیے، اُن کے مطابق لکھنے کی مشق کیجیے۔

5۔ ایک چارٹ تیار کیجیے جس میں پاکستانی پرچم کی تصویر ہو اور اس کے نیچے قومی ترانہ لکھّا ہو۔

سعودی عرب

رمضان کا مہینا ختم ہُوا۔ گھر گھر عید کی خُوشیاں منائی گئیں۔ ابھی عید کی رونق باقی تھی کہ حج کی تیاریاں شرُوع ہو گئیں۔ کوئی گاؤں، قصبہ یا شہر ایسا نہ تھا جہاں سے حج پر جانے والوں کے دو چار قافلے تیّار نہ ہوں۔ ایک روز عمران نے دیکھا کہ اس کے محلّے کے کچُھ لوگ گلے میں پھُولوں کے ہار ڈالے، نعتیں پڑھتے، حج پر روانہ ہو رہے ہیں اور شہر کے بہت سے لوگ انھیں الوداع کہنے کے لیے ان کے ساتھ ریلوے سٹیشن تک جا رہے ہیں۔ عمران کو یہ نظارہ اتنا بھلا لگا کہ وُہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا، لیکن اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ حج کے لیے یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔

اسی روز جب شام کو عمران اپنے ابّا اور امّی کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا تو ابّا بولے کہ آج میاں محمّد اسلم اور ان کے بھائی میاں محمّد اکرم حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ عمران کی امّی بولیں: "میاں صاحب کی بیگم بھی تو ساتھ گئی ہیں۔"

حج کی بات چل نکلی تو عمران کو وُہ سوالات کرنے کا موقع مِل گیا جو صُبح سے اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ وُہ بولا: "ابّو! حج کرنے کے لیے لوگ کہاں جاتے ہیں۔ وہاں کے کچُھ حالات تو بتایئے۔" ابّا نے جواب دیا: "لوگ حج کرنے کے لیے جس مُلک میں جاتے ہیں اس کا نام سعودی عرب ہے۔ سعودی عرب پاکستان کا عزیز ترین دوست ہے۔ شاہ فیصل شہید کا نام تو تُم نے سُنا ہو گا۔ وُہ اسی مُلک کے بادشاہ تھے۔" عمران نے پوُچھا: "ابّو! لوگ اِسی مُلک میں حج کرنے کیوں جاتے ہیں، کہیں اور کیوں نہیں جاتے؟" ابّا جان مُسکرا کر بولے۔ عُمران میاں! حج کا مطلب ہے بیت اللہ کی زیارت کرنا اور وہاں جا کر اللہ کو یاد کرنا۔ لوگ سعودی عرب میں اِس لیے جاتے ہیں کہ اس میں بیت اللہ ہے۔ اسی کا نام کعبہ ہے۔ ہم سب کعبے کی طرف

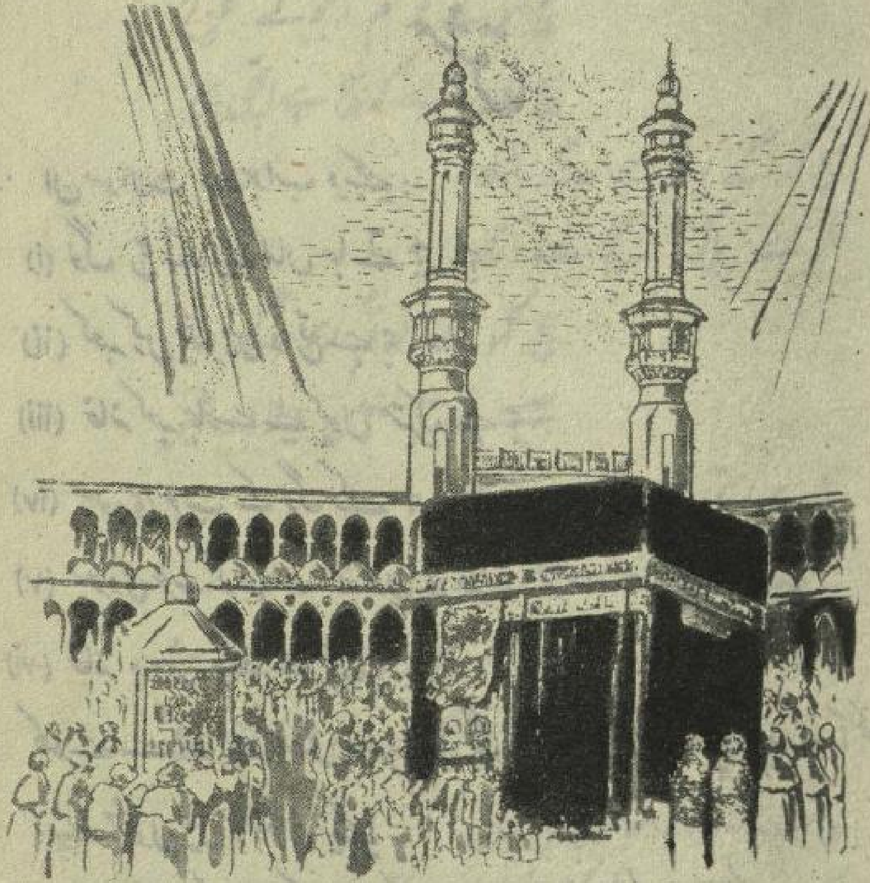
مُڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔ کعبہ سعودی عرب کے سب سے بڑے شہر مکّہ مکرّمہ میں واقع ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمّد صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم اسی شہر میں پیدا ہُوئے تھے۔ اِس شہر کا رُتبہ دُنیا کے تمام شہروں سے بلند ہے۔

عمران کے ابّو نے بتایا: "سعودی عرب کا دُوسرا مبارک شہر مدینہ منورہ ہے۔ اس شہر کا مرتبہ بھی بہت اُونچا ہے۔ یہاں ہمارے رسولِ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا روضۂ اقدس ہے۔ جو لوگ حج کو جاتے ہیں، وُہ اِنھی دو شہروں میں قیام کرتے ہیں۔" عمران نے پُوچھا: "کیا سعودی عرب میں یہی دو شہر ہیں؟" ابّا جان نے جواب دیا: "نہیں تو! اس مُلک میں اور بھی بہت سے شہر ہیں۔ اس مُلک کے دارالحکومت کا نام ریاض ہے۔ جدّہ یہاں کی مشہور بندرگاہ ہے۔ جدّہ کراچی سے بہت مِلتا جُلتا شہر ہے۔ وہی سمندر کا کنارا، اُونچی اُونچی عمارتیں، کشادہ سڑکیں، خُوبصُورت بازار، ہوٹل، مدرسے، ہسپتال یہاں بھی موجُود ہیں۔ آئے دن مُلک مُلک سے بحری جہاز سامان سے لدے ہُوئے یہاں آتے ہیں۔ صِرف بحری جہاز ہی نہیں، بلکہ ہوائی جہاز بھی۔ حج کے دِنوں میں تو یہاں خُوب رونق ہوتی ہے۔"

عمران بولا: "ابّو! سعودی عرب کے لوگ کیسے ہیں، وُہ کیا کرتے ہیں؟ وہاں کی پیداوار کیا ہے، آب و ہوا کیسی ہے؟" ابّا جان نے کہا: "بیٹے! تُم نے تو بہت سے سوال ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔ اب باری باری اُن کے جواب بھی سُن لو۔ یہاں کے لوگ نہایت اچھّے، خُوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور پکّا وعدہ کرتے ہیں۔ انھیں اسلام سے بڑی محبّت ہے۔ وُہ سچّے مُسلمان ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ شہروں میں کاروبار کرتے ہیں۔ یہ لوگ بہت خُوش حال ہیں۔ دیہات کے لوگ محنت مزدُوری کرتے ہیں۔ اس مُلک کو اللہ تعالیٰ نے مٹّی کے تیل کی دولت کثرت سے عطا کی ہے۔ سعُودی عرب کو مٹّی کے تیل سے بہت آمدنی ہوتی ہے، اِتنی آمدنی کہ وُہ اس سے دُنیا کے بہُت سے مُسلمان مُلکوں کی مدد کرتا ہے۔" ابّا جان نے بات جاری رکھتے ہُوئے کہا: "سعُودی عرب

کی زمین زرخیز نہیں۔ یہاں زیادہ تر صحرا اور خُشک پہاڑ ہیں۔ پانی کی قِلّت ہے۔ جس جس علاقے
میں پانی وافر مقدار میں موجُود ہے، وہاں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ کے اِرد گِرد
کھجُوروں کے باغات ہیں۔ حاجی یہاں سے کھجُوریں بطور تبرک لے جاتے ہیں۔ ویسے اس
مُلک میں پھلوں کی قِلّت ہے۔ کیلا، سیب، خوبانی، مالٹا سب دُوسرے ممالک سے آتے ہیں
یہاں کی آب و ہَوا سخت گرم ہے۔ دن کو تیز لُو چلتی ہے تو باہر نکلنا دُشوار ہو جاتا ہے۔ بعض
علاقوں میں البتّہ سردی بھی پڑتی ہے۔ یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ اِسی لیے یہاں دریا ہیں نہ نہریں
عمران کے ابّا نے بتایا: "سعُودی عرب کی ایک متبرک چیز زم زم کا پانی ہے۔ زم زم
ایک چشمے کا نام ہے جو مکّہ مکرمہ میں حرم میں موجُود ہے اور آج سے نہیں ہزاروں سال سے
ہے، لیکن نہ اس کے پانی میں کمی آتی ہے، نہ ذائقے میں فرق آتا ہے۔ حجّاج یہاں سے زم زم
کا پانی ضرور اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس پانی میں خُدا نے شفا رکھی ہے۔ کِسی زمانے میں
عرب کے لوگ خانہ بدوش ہوتے تھے۔ جہاں چند درخت اور پانی کا چشمہ نظر آتا، خیمے لگا
لیتے۔ جب سبزہ اور پانی ختم ہو جاتا تو وہاں سے خیمے اُکھاڑتے اور کہیں اور کی راہ لیتے
لیکن اب وُہ بات نہیں رہی۔ اب لوگوں نے مستقل بستیاں بسا لی ہیں، شہر آباد کر لیے ہیں
پھر بھی بہت سے عرب یہاں بھیڑ بکریاں پالتے ہیں اور پہاڑوں کے دامن میں زندگی بسر
کرتے ہیں۔ کبھی یہاں اونٹوں کا بہت رواج تھا۔ صحرا میں سواری کے لیے یہی کام آتے تھے
لیکن جب سے یہاں سڑکیں بنی ہیں، اُونٹوں کی جگہ موٹروں، بسوں اور ٹرکوں نے لے لی ہے
کبھی یہاں عراق سے مدینہ منوّرہ تک ریل گاڑی بھی چلا کرتی تھی، لیکن اب ریل کی جگہ
ہوائی جہاز اُڑتے ہیں اور کاریں چلتی ہیں۔ لمبی لمبی کاریں اور بسیں ریل گاڑی کی کمی کو
محسُوس نہیں ہوتے دیتے۔ سعودی عرب آج کل بہت ترقّی کر رہا ہے۔ وہاں دولت
کی کوئی کمی نہیں۔ کارخانے لگائے جا رہے ہیں۔ شہروں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی
ہے۔ وہاں کے بچّوں کو علم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں

مدرسے کُھلے ہُوئے ہیں۔ حج کے زمانے میں یہاں اِتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ گلیوں اور بازاروں میں کھوے سے کھوا چِھلتا ہے۔ مکّے میں بیت اللہ شریف اور مدینہ منوّرہ میں مسجدِ نبویؐ میں تِل دھرنے کی جگہ نہیں رہتی۔ مکّہ مکرّمہ سے تھوڑی ہی دُور مِنیٰ کے میدان میں حجّاج حج کے لیے جمع ہوتے ہیں تو ہزاروں خیموں کا ایک شہر آباد ہو جاتا ہے۔ ذرا بُلندی پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو یہ منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔"



بیتُ اللہ شریف

خیموں کے شہر کی بات سُنی تو عمران کی اُمّی کی آنکھوں کے سامنے وہ فلم گھوم گئی جو پچھلے برس اُنھوں نے حج کے موقع پر ٹیلی ویژن پر دیکھی تھی۔ ہر رنگ، ہر نسل اور ہر مُلک کے لوگ لیکن سب ایک ہی قِسم کی چادریں اوڑھے ایک خُدا کی بارگاہ میں جُھکتے اور سجدہ کرتے اُنھیں کتنے بھلے لگے تھے۔ اس فلم میں اُنھوں نے دیکھا تھا کہ سب لوگ

برابر ہیں، نہ کوئی امیر ہے نہ غریب۔ اُنھوں نے اس وقت سوچا تھا کہ اسلام کس قدر عظیم مذہب ہے۔ مُسلمان کتنے عجیب لوگ ہیں۔ عمران کی امّی اُسے فلم کی بات سُنا رہی تھیں کہ اُس کے ابّا نے کہا: "انشاء اللہ ہم بھی اگلے سال حج پر چلیں گے۔" عمران نے یہ سُنا تو مارے خُوشی کے اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس کی امّی کی آنکھوں میں تو سچ مُچ خُوشی کے دو موٹے موٹے آنسُو موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔

مشق

1۔ ان سوالات کے جواب دیجیے:۔
(i) لوگ حج کے لیے کہاں جاتے ہیں؟
(ii) کعبہ کِس شہر میں واقع ہے؟
(iii) خانہ کعبہ ہمارے لیے کیوں متبرک ہے؟
(iv) سعودی عرب کے لوگ کیسے ہیں؟
(v) سعودی عرب کو قدرت نے کون سی دولت کثرت سے عطا کی ہے؟
(vi) خانہ بدوش کِسے کہتے ہیں؟

2۔ کھوے سے کھوا چِھلنا۔ تِل دھرنے کی جگہ نہ ہونا۔ قابلِ دید۔ کھنچے چلے آنا۔ آنکھیں ترسنا کو اپنے جملوں میں اِستعمال کیجیے۔

3۔ "فرفر کرتی موٹریں" کی طرز پر کچھ اور تراکیب بنائیے مثلاً "ٹرٹر کرتے مینڈک"۔

4۔ زم زم کے بارے میں آپ نے جو کچُھ پڑھا ہے، اسے اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

5۔ اس سبق سے پانچ ایسے فِعل چُنیے جِن میں موجُودہ زمانہ پایا جائے۔ مثلاً جاتے ہیں، کرتا ہوں۔ کھاتی ہے۔

سچ

سچ کہو! سچ کہو! ہمیشہ سچ
ہے بھلے مانسوں کا پیشہ سچ

سچ کہو گے تو تم رہو گے عزیز
سچ تو یہ ہے کہ سچ ہے اچھّی چیز

سچ کہو گے تو تُم رہو گے شاد
فکر سے پاک رنج سے آزاد

سچ کہو گے تو تُم رہو گے دلیر
جیسے ڈرتا نہیں دلاور شیر

سچ سے رہتی ہے تقوِیت دِل کو
سہل کرتا ہے سخت مُشکل کو

جس کو سچ بولنے کی عادت ہے
وہ بڑا نیک با سعادت ہے

سچ ہے سارے معاملوں کی جان
سچ سے رہتا ہے دِل کو اطمینان

سچ سے راحت ہے اور آسانی
سچ سے ہوتی نہیں پشیمانی

سچ ہے دُنیا میں نیکیوں کی جڑ
سچ نہ ہو تو جہان جائے اُجڑ

سچ کہو گے تو دِل رہے گا صاف
سچ سے ہو جائیں گے قصُور معاف

سچ سے زِنہار در گزر نہ کرو
دِل میں کچُھ خوف اور خطر نہ کرو

وہی دانا ہے جو کہ ہے سچّا
اس میں بُوڑھا ہو یا کوئی بچّہ

ہے بُرا جھُوٹ بولنے والا
آپ کرتا ہے اپنا مُنہ کالا

فائدہ اس کو کچُھ نہ دے گا جھُوٹ
جائے گا ایک روز بھانڈا پھُوٹ

جھُوٹ کی بُھول نہ کر ڈالو خُو
جھُوٹ ذلّت کی بات ہے "اُخ تھُو"

(اسمٰعیل میرٹھی)

مشق

1- سچ کی خُوبیاں اور جھُوٹ کے نقصان الگ الگ بیان کیجیے۔
2- اپنے پسندیدہ شعر کاپی میں خُوش خط لکھیے۔
3- عزیز۔ دلاور۔ تقویت۔ سہل۔ پشیمانی۔ زِنہار۔ درگزُر کرنا۔ بھانڈا پھُوٹنا کے معنی یاد کیجیے۔
4- سچ کے متعلق کوئی کہانی سنائیے۔

عِلمی مقابلہ

فرحت کی جماعت میں ہر ہفتے ایک علمی مقابلہ ہوتا ہے، جس میں ایک لڑکی اپنی ہم جماعتوں سے سوال کرتی ہے اور باقی لڑکیاں سوچ کر اس کا جواب دیتی ہیں۔ اس مقابلے میں حِصّہ لینے کے لیے بچّیاں ہفتہ بھر تیاری کرتی رہتی ہیں۔ خاص طور پر جس لڑکی کی باری سوال کرنے کی ہوتی ہے، وہ اخباروں، رسالوں اور کتابوں کا خُوب مطالعہ کرتی ہے اور اچھّے اچھّے علمی سوال ڈھونڈ کر لاتی ہے۔ وُہ اپنے سوالوں کے جواب بھی اچھّی طرح یاد کر کے آتی ہے۔ کیونکہ اگر جماعت میں سے کوئی بچّی سوال کا صحیح جواب نہ دے سکے تو سوال کرنے والی صحیح جواب بتا کر انعام حاصل کرتی ہے۔ اس کھیل سے سب کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔

آج فرحت کی باری تھی۔ وُہ سوال سوچ کر آئی تھی۔ علمی مقابلے کا وقت شرُوع ہُوا تو اُستانی صاحبہ نے فرحت کو اپنی میز کے پاس کرُسی پر بٹھا دیا۔ سب لڑکیاں کتابیں سمیٹ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ اُستانی جی سے اجازت لے کر فرحت بولی :
"میرا سوال انسان کے متعلق ہے۔ آپ سب جانتی ہیں کہ انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ یعنی دُنیا میں جتنی چیزیں پیدا کی گئی ہیں، انسان ان سب میں اُونچا مرتبہ رکھتا ہے۔ بتائیے، انسان میں وہ کون سی خاص صفت ہے جو دُوسرے جانوروں میں نہیں؟"
شبانہ نے فوراً ہاتھ کھڑا کر دیا۔ اُستانی صاحبہ نے فرمایا "بتاؤ! شبانہ تُم نے کیا جواب سوچا ہے؟"
شبانہ : جناب جانوروں کے سینگ ہوتے ہیں، انسان کے سینگ نہیں ہوتے۔
یہ جواب سُن کر سب لڑکیاں کِھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اُستانی صاحبہ بولیں :

"بیٹی شبانہ! تُم نے اپنی بات پر غور نہیں کیا۔ سوال یہ تھا کہ انسان میں کون سی صفت ہے جو جانوروں میں نہیں۔ اور تُم نے یہ بتایا ہے کہ جانوروں کے سینگ ہیں جو انسان کے نہیں۔ یہ تو اُلٹا جواب ہُوا۔ اچھّی طرح سوچ کر جواب دینا چاہیے۔"

اِتنے میں نسیم نے ہاتھ کھڑا کر دیا اور اجازت ملنے پر کہنے لگی: "انسان کا مرتبہ اس لیے بلند ہے کہ وہ دُوسرے جانوروں سے زیادہ طاقت وَر ہے۔"

فرحت: "جی نہیں! شیر، چیتا اور ہاتھی انسان سے کہیں زیادہ طاقت وَر ہیں۔ کوئی انسان طاقت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اِس لیے جواب غلط ہے۔"

نسیم: غلط کیسے جی! ٹھیک تو ہے میرا جواب! دیکھو نا! شیر، چیتے اور ہاتھی جیسے جانور تو انسان کا کہنا مانتے ہیں۔ وہ پھر طاقت وَر کیسے نہ ہُوا؟

اُستانی: نسیم بیٹی! یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ فضول بحث نہ کرو۔ جب صحیح جواب بتایا جائے گا تو مقابلہ کر کے دیکھنا کہ تُمھارا جواب کِس حد تک صحیح تھا۔ اب کِسی اور کو بولنے کا موقع دو۔

اِتنے میں سمیعہ اُٹھ کھڑی ہُوئی اور بولی:

"میرے خیال میں انسان اس لیے اشرف المخلوقات ہے کہ وہ انسان ہے اور باقی سب حیوان ہیں۔"

اُستانی: سُبحان اللہ! یہ کیا جواب ہُوا۔ شاید تُمھیں یہ معلوم نہیں کہ انسان کو حیوانوں ہی کی ایک قِسم شمار کیا جاتا ہے۔ اِس کائنات میں تین طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک وہ جن میں ہلنے جُلنے، بڑھنے اور پھلنے پھُولنے کی صلاحیّت نہیں، انھیں جمادات کہتے ہیں۔ جیسے مٹی، پتّھر، لوہا وغیرہ۔ دُوسری وہ چیزیں ہیں جو بڑھتی اور پھلتی پھُولتی ہیں مگر اپنے ارادے سے حرکت نہیں کر سکتیں جیسے درخت اور پودے، یہ نباتات ہیں۔ تیسری وہ چیزیں جو اپنی مرضی سے حرکت بھی کرتی ہیں، بڑھتی اور ترقّی بھی کرتی ہیں۔ یہ حیوانات ہیں، جن میں چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے لے کر ہاتھی، شیر، انسان سب شامل ہیں۔ حیوان

کے معنی ہیں، زندہ چیز۔ اسی لیے ان معنوں میں انسان کو بھی حیوان کہا جاتا ہے۔
فرحت: سمیعہ نے سوال پر بھی غور نہیں کیا۔ پوچھا یہ گیا ہے کہ اِنسان کی وہ خاص صفت یا خُوبی بتائی جائے جس کی وجہ سے وہ دُوسروں سے بُلند مرتبہ ہے۔ صِرف نام سے کیا فرق پڑتا ہے!

اب سب لڑکیاں سوچ میں ڈُوب گئیں۔ بات تھی بھی غور کرنے کی۔ آخر یہ اِنسان جو اِتنا لمبا اُونچا نہیں لیکن قوی ہیکل ہاتھیوں پر سواری کرتا ہے۔ اس کے پَر نہیں لیکن ہواؤں میں پرواز کرتا ہے۔ مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرتا ہے۔ پہاڑوں کو چیرتا اور دریاؤں کے رُخ موڑتا ہے۔ آخر اِس میں خاص بات کیا ہے!! کھانے پینے سونے جاگنے میں تو وُہ دُوسرے جانوروں سے زیادہ مختلف نہیں۔

انجم جو اَب تک خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی، اُٹھ کھڑی ہُوئی اور بولی: "میرے خیال میں انسان کی سب سے بڑی خُوبی عقل اور عِلم ہے، جِس سے دُوسرے حیوان محروم ہیں"
اُستانی: کیوں فرح! کیا یہ جواب دُرست ہے؟
فرحت: جی ہاں! جواب ٹھیک ہے۔ انسان علم اور عقل ہی کی وجہ سے اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ انسان نے جنگلی زندگی کو چھوڑ کر شہر آباد کیے۔ زندگی گزارنے کے لیے سہُولت اور آرام کی بے شمار چیزیں ایجاد کیں۔ بیماریوں کی روک تھام کے لیے دوائیں تیّار کیں اور عِلم و عقل سے کام لے کر دریاؤں اور سمندروں پر قابُو پا لیا۔ ہواؤں کی طاقت سے فائدہ اُٹھایا۔ سُورج کی شعاعوں کو قابُو میں لا کر اُن سے حرارت اور توانائی حاصل کی۔ ترقّی کرتے کرتے انسان نے ایسے راکٹ بھی بنا لیے، جن میں سوار ہو کر وہ چاند پر بھی جا پہنچا۔ یہاں سے اب میرا دُوسرا سوال شرُوع ہوتا ہے۔ بتائیے سب سے پہلا اِنسان جِس نے چاند پر قدم رکھّا وہ کون تھا؟
عمرانہ: پہلا خلا باز جِس نے چاند پر قدم رکھّا وہ یوری گاگرین تھا۔

فرحت: نہیں! یہ تو ٹھیک ہے کہ گاگرین وُہ پہلا شخص ہے جس نے خلا میں سفر کیا لیکن وہ چاند پر نہیں پہنچ سکا۔

نسرین: مَیں بتاتی ہُوں۔ چاند پر قدم رکھنے والا پہلا شخص امریکہ کا خلا باز نیل آرمسٹرانگ تھا جو 1969ء میں اپنے ایک ساتھی سمیت چاند پر اُترا اور اسی نے چاند کی سطح پر سب سے پہلے قدم رکھّا۔

اُستانی: شاباش نسرین! تمھارا جواب بالکُل درست ہے۔ آج کا علمی مقابلہ ختم ہوتا ہے۔ مَیں فرحت کو شاباش دیتی ہوں جو اِتنے اچھّے سوالات تیّار کر کے لائی۔ نسرین اور انجم مبارک کی مستحق ہیں، جنھوں نے دونوں سوالوں کے صحیح صحیح جواب دیے۔ اگلی بار دُردانہ سوال پُوچھے گی۔

مشق

1- سبق میں سے مُشکل الفاظ چُن کر تہجّی ترتیب سے لکھیے اور لُغت میں ان کے معنی تلاش کیجیے۔

2- "سمیٹ سماٹ" کی طرح کے پانچ مرکّب لکھیے جیسے گھیر گھار۔ چھوڑ چھاڑ..... وغیرہ۔

3- اعراب لگا کر صحیح تلفُّظ بتائیے :- صفت۔ وقت۔ غلط۔ عقل۔

4- جمادات۔ نباتات اور حیوانات کا فرق بتائیے۔

5- علمی مقابلے کے لیے تین تین سوال تیّار کیجیے۔

6- اس سبق میں سے دس الفاظ ایسے چُن کر لکھیے جو مذکّر بولے جاتے ہیں۔

ہمارے نبی صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم

آپؐ کی ذات سب سے اعلیٰ ہے
آپؐ کی بات سب سے اعلیٰ ہے
آپؐ کا نام سب سے اچھّا ہے
آپؐ کا کام سب سے اچھّا ہے

آپؐ ہی سے جہاں میں رونق ہے
سارے کون و مکاں میں رونق ہے
حق کا پیغام آپؐ لائے ہیں
دینِ اسلام آپؐ لائے ہیں

آپؐ نے سب کی رہنُمائی کی
ساری مخلُوق سے بھلائی کی
غم کے ماروں کی دستگیری کی
بے سہاروں کی دستگیری کی

آپؐ نے فقر کو پسند کیا
خاکساروں کو سر بلند کیا
آپؐ رحمت سے کام لیتے ہیں
گِرنے والوں کو تھام لیتے ہیں

آپؐ رحمت ہیں دو جہاں کے لیے
آپؐ رافت ہیں انس وجاں کے لیے

روشنی آپؐ ہی کے دم سے ہے
زندگی آپؐ کے قدم سے ہے

اے یتیموں کے غمگُسار سلام
اے مدینے کے تاجدار سلام

(اسحٰق جلالپوری)

مشق

1- یہ نعت زبانی یاد کیجیے۔
2- اس نعت میں حضور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی جو صفات بیان ہُوئی ہیں، انھیں اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔
3- ان لفظوں کے معنی لُغت میں سے تلاش کر کے اپنی کاپی میں لکھیے:۔
دستگیری۔ کون ومکاں۔ فقر۔ خاکسار۔ رافت۔ غمگُسار۔ تاجدار۔
4- نیچے لکھے ہُوئے ہر لفظ کے چار چار ہم قافیہ الفاظ لکھیے:۔
نام — بھلائی — پسند۔

محبّت کا پیغام

اِنسان کی اصل فطرت اُنس اور محبّت ہے۔ اچھے اِنسان مِل جُل کر رہتے ہیں۔ دُکھ سُکھ میں ایک دُوسرے کے ساجھی بنتے ہیں۔ ایک دُوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اُنس و محبّت کا یہی فطری جذبہ انسانوں کو ایک دُوسرے کا احترام کرنا، دُوسرے کے لیے قربانی دینا اور نیکی کے کام کرنا سکھاتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اِنسان جب مِل جُل کر رہتے ہیں تو ان میں کئی طرح کی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ بعض اوقات آدمی اپنے آپ کو دُوسروں سے بڑا اور بہتر سمجھنے لگتا ہے۔ اس جذبے کے تحت وہ دُوسروں سے محبّت کی جگہ نفرت کرنے لگتا ہے۔ اگر اس کے پاس طاقت ہو تو وہ دُوسروں پر حُکم چلانے لگتا ہے۔ اگر اس کے پاس دولت ہو تو دُوسروں کو اپنا محتاج دیکھنا پسند کرتا ہے۔ ایسے آدمی میں اس ایک بُرائی کی وجہ سے کئی اور بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ خُود غرض اور لالچی بن جاتا ہے۔ اس کے سر میں غرور اور تکبّر بھر جاتا ہے۔

اِنسان جس طرح ایک دُوسرے سے اچھّی باتیں سیکھتے ہیں اسی طرح وہ دُوسروں کی بُرائیاں بھی اپنا لیتے ہیں۔ اس طرح بُرائیاں پھیلتے پھیلتے پُوری قوم کو خراب کر دیتی ہیں حتیٰ کہ وہ قوم دُوسری قوموں سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ یہی چیز قوموں میں دُشمنی اور اس کے بعد جنگ و جدل کا سبب بنتی ہے۔ گویا ایک انسان کے دِل میں پیدا ہونے والا بُرا جذبہ بڑھتا اور پھیلتا جائے تو بے شمار اِنسانوں کے لیے خرابی اور بربادی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ انسانی معاشرے کو امن اور سلامتی میں رکھنے کے لیے ضرُوری ہے کہ اِنسانوں کے دِلوں میں محبّت کے جذبات اُبھارے جائیں اور اُنھیں اِنسانی مساوات اور اِحترام کا سبق سِکھایا جائے۔

اللہ کے جو نیک بندے معاشرے کی اصلاح کا کام انجام دیتے ہیں ان میں انبیا کے بعد علما اور صُوفیا کو خاص مقام حاصل ہے۔ صُوفیا لفظ صوفی کی جمع ہے۔ صُوفی اس شخص کو کہتے ہیں جس کا دل تمام بُرے جذبوں سے پاک صاف ہو اور اس کا عمل نیک اور پاکیزہ ہو۔

ہماری پاک سرزمین میں بہت سے صُوفیائے کرام پیدا ہُوئے جِنھوں نے اپنے اپنے دَور میں نیکی اور محبّت کی شمع روشن کی۔ صُوفیائے کرام میں حضرت سلطان باہُو، بابا فرید، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، رحمان بابا، پیر بابا، لعل شہباز قلندر، بُلّھے شاہ، پیراں شاہ غازی سیّد عبداللہ اور بابا خرواری شامل ہیں۔ اگرچہ یہ بزرگ مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں پیدا ہُوئے لیکن ان سب کا دِین ایک اور ان سب کی تعلیم ایک تھی۔ ان میں بہت سے بزرگ ایسے ہیں جِنھوں نے اپنی تعلیم عام کرنے کے لیے شعروں کا سہارا لیا تاکہ لوگ ان کے کلام کو شوق سے سُنیں اور آسانی سے یاد کر سکیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے نغمے، سُلطان باہُو کے بیت، خواجہ فرید کے دوہے، بُلّھے شاہ کی کافیاں، سینکڑوں لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ گانے والے یہ کلام گا کر سُناتے ہیں اور سُننے والے سَر دُھنتے ہیں۔

ان بزرگوں کے کلام کی خُوبی یہ ہے کہ وہ کانوں کی راہ سے دِل میں اُتر جاتا اور گہرا اثر پیدا کرتا ہے۔ اس طرح نیکی کی یہ تعلیم خُود بخُود پھیلتی جاتی ہے۔ صوفیا کی تعلیم کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ لفظ ہے "محبّت"۔ یعنی اللہ سے محبّت اور اللہ کے بندوں سے محبّت۔ ایسی محبّت جس کی بنیاد کسی غرض یا لالچ پر نہ ہو۔ ایسی محبّت جو کسی ڈر یا خوف کی وجہ سے نہ ہو، ایسی محبّت جس کے لیے کِسی اجر یا بدلے کی خواہش نہ ہو۔ محبّت کا یہی وہ پیغام ہے جو اللہ کے پاک رسُولوں نے انسانوں تک پہنچایا اور محبّت کا یہی وہ پیغام ہے جو صُوفیا نے دُنیا کے کونے کونے میں پھیلایا۔

اِنسانوں سے سچّی محبّت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب انسانوں کو برابر سمجھیں ہمارے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے ارشاد کے مطابق سب اِنسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ کسی عربی کو عجمی پر یا کسی عجمی کو عربی پر کوئی برتری حاصل نہیں۔

صُوفیائے کرام نے انسانی تفریق کو دُور کیا۔ انسان خواہ کسی خطّے یا علاقے کا رہنے والا ہو اس کا اِحترام لازم ہے۔ رنگ، نسل، زبان یا خاندان کی وجہ سے کسی اِنسان کو بلند اور کسی اِنسان کو پست نہیں کہا جا سکتا۔ ہر رنگ اور ہر نسل کا اِنسان، انسان ہے اور محبّت و احترام کا مستحق ہے۔ زبان اور لباس کا فرق انسانی درجہ بندی سے کوئی تعلّق نہیں رکھتا۔ صُوفیا کا پیغام سب کے لیے ہے۔ ان کی ہدایت سب کے لیے ہے اور ان کی محبّت بھی سب کے لیے ہے۔ ہمارے یہ بزرگ کسی جگہ سے بھی تعلُّق رکھتے ہوں، ہم ان کا ادب کرتے ہیں، ان کی تعلیم کو دِل و جان سے قبُول کرتے ہیں اور اُن کی باتوں پر عمل کر کے اچھّے اِنسان بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

مشق

1- صُوفیائے کرام نے اِنسانی تفریق کو کیسے دُور کیا؟

2- سچّی محبّت کا تقاضا کیا ہے؟

3- اپنے علاقے کے کسی مشہور بزُرگ کا حال لکھیے:۔

4- ان الفاظ کے معنی لکھیے اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:۔

ساجھی - محتاج - خودغرض - انجام - اصلاح - بلند - پست -

دَرزی

رمضان کا آخری عشرہ ہے۔ عید کی آمد آمد ہے۔ بازاروں میں بھیڑ لگی ہے۔ ابھی سے عید کی خریداری ہو رہی ہے۔ احمد اور نسیمہ بھی اپنے ابّا کے ساتھ بازار میں گھوم رہے ہیں۔ نسیمہ نے چوڑیاں پہنیں اور احمد نے بُوٹ خریدے۔ اچانک نسیمہ اور احمد نے اپنے ابّا کو یاد دلایا کہ دَرزی نے اُن کے جوڑے آج تیّار کرنے کا وعدہ کیا تھا چنانچہ وہ تینوں دَرزی کی دُکان پر پہنچے۔ یہ حبیب درزی کی دُکان ہے۔



سِلے ہوئے کپڑے الماریوں میں قرینے سے رکھّے ہیں۔ حبیب کا بیٹا بھی دُکان پر بیٹھا کپڑے سی رہا ہے۔ یہ لڑکا اگرچہ میٹرک پاس ہے لیکن حبیب نے اسے اس کام پر لگا دیا ہے۔ خُود حبیب اپنے

اڈے پر کھڑا کپڑے بیونت رہا ہے۔ کپڑے بیونتنے کے بعد بچی ہُوئی کترنیں اُٹھا کر اُس نے ایک ڈبّے میں ڈال دیں۔ اور بیونتا ہُوا کپڑا اُٹھا کر اپنے بیٹے کو سِینے کے لیے دے دیا۔ ایک شاگرد پاس بیٹھا ہُوا کاج بنا کر بٹن ٹانک رہا ہے۔ یہی شاگرد کپڑوں پر اِستری بھی کر دیتا ہے۔

حبیب ایک بچّے کی شلوار قمیص کا ناپ لینے لگا۔ اس نے بچّے کو اپنے ساتھ کھڑا کیا اور فیتے سے تیرہ، آستین، گلا، چھاتی، کمر اور لمبائی کی پیمائشیں رنگین چاک سے کپڑے پر لکھ دیں۔ جب وہ ناپ لینے سے فارغ ہُوا تو اس کی نظر نسیمہ اور احمد پر پڑی۔ اُس نے مسکراتے ہُوئے نسیمہ کے ابّا کو سلام کیا اور کہا: "نسیمہ اور احمد آ گئے اپنے کپڑے لینے"۔ نسیمہ اور احمد نے بھی اسے سلام کیا اور کہا: "آپ نے آج ہی کا وعدہ تو کیا تھا"۔ اُس نے کہا "ہاں مجھے اپنا وعدہ یاد ہے"۔ پھر اُس نے نسیمہ کا جوڑا نکال کر ان کو دِکھایا۔ احمد نے کہا: "کیا میری پتلون اور بش شرٹ تیار نہیں ہُوئی؟" حبیب نے کہا کیوں نہیں! دونوں کپڑے تیار ہیں۔ آپ ذرا یہ بش شرٹ پہن کر دیکھیے"۔ احمد نے بش شرٹ پہن کر دیکھی تو بالکل ٹھیک تھی۔ صِرف بٹن ٹانکنا باقی تھے۔ شاگرد نے جلدی سے انگشتانہ چڑھایا اور بٹن ٹانکنے لگا۔ احمد کے ابّا نے حبیب سے کہا: "یہ تُم نے بہت اچھا کیا کہ اسے یہ ہُنر سِکھا دیا"۔ حبیب بولا "ہاں بابو جی - یہ ہمارا آبائی پیشہ ہے۔ یہ لڑکا ہوشیار ہے۔ تھوڑے ہی دِنوں میں بڑا اچھا کام کرنے لگا ہے"۔ "ہاں بھئی تمہارا بیٹا ہے۔ محنت تو اس کی گھُٹی میں پڑی ہے"۔ احمد کے ابّا نے کہا: "بابو جی! ملازمت میں کیا رکھا ہے۔ یہ ہُنر سیکھ لے گا تو عزّت کی روٹی کما کھائے گا"۔ حبیب نے کہا۔ احمد کے ابّا اور حبیب تو باتیں کر رہے تھے لیکن احمد کپڑے کی سلائی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کپڑا از خود آگے سرکتا چلا جا رہا تھا۔ مشین کا پہیّہ تیزی سے گھوم رہا تھا۔ کاری گر کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔

اتنے میں مشین کا دھاگا ٹوٹ گیا۔ اُس نے مشین کو کھولا اور نیچے سے ایک پھرکی نکالی جس میں دھاگے کی ایک رِیل پھنسی ہُوئی تھی۔ اس نے وہ رِیل نکال کر پھرکی کو صاف کیا اور پھر رِیل اس میں پھنسا دی۔ پہیہ پھر تیزی سے گھومنے لگا۔ سُوئی زور زور سے چلنے لگی۔ احمد بہت حیران ہُوا اور اُس نے کہا "اس مشین میں تو دو دھاگے چل رہے ہیں۔ ایک اُوپر سے سُوئی کے ناکے میں سے گُزر رہا ہے اور دُوسرا نچلی پھرکی میں سے آتا ہے۔" حبیب نے کہا: "بابوجی! مشین میں دو دھاگے بیک وقت چلتے ہیں اور بخیے کو دیکھیں تو کپڑے کے دونوں جانب سیدھے اور صاف ٹانکوں کی ایک قطار نظر آتی ہے۔" نسیمہ نے کہا: "ابّوجان! یہ سب باتیں ہم نے سلائی کے کام میں سیکھی تھیں۔" احمد کے ابّا نے کہا: "احمد، اب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ مشین سِلائی کا کام کس طرح کرتی ہے۔" احمد نے کہا: "جی ابُّو! یہ مشین بڑے کام کی چیز ہے، اِس کی مدد سے دِنوں کا کام گھنٹوں اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے اور پھر سِلائی بھی بڑی مضبُوط اور نفیس ہوتی ہے۔"

حبیب نے کہا: "اب تو سِلائی کی مشینوں کے ساتھ مختلف پُرزے لگا کر ان سے کئی کام لیے جاتے ہیں۔ ان سے جھالر بنانے، سنجاف لگانے اور لہریا بنانے کا کام بھی کیا جا سکتا ہے۔" اِتنے میں لڑکے نے بٹن ٹانک دیے اور بش شرٹ تیار ہو گئی۔

احمد کے ابّا نے کہا: "معاف کیجیے گا، ہم نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا۔" حبیب نے کہا: "بابُوجی! آپ شرمندہ نہ کریں آپ سے مِل کر بہت خُوشی ہوتی ہے۔"

مشق

1- ان سوالوں کے جواب دیجیے :-

(i) آخری عشرے سے کیا مُراد ہے ؟

(ii) دَرزِی کپڑا کیسے سِیتا ہے ؟

(iii) دَرزِی انگشتانہ کیوں استعمال کرتے ہیں ؟

2- سلائی کی مشین کے فائدے بیان کیجیے ۔

3- یہ پیشہ وَر کیا کیا کام کرتے ہیں :-

لوہار ۔ بڑھئی ۔ دھوبی ۔ موچی ۔ نائی ۔

4- اس سبق میں سے ایسے دس فعل چُن کر لکھیے جن میں گزرا ہُوا زمانہ پایا جائے ۔

5- بیونتنا ۔ سنجاف ۔ شرمندہ ۔ آستین ۔ وعدہ ۔ ملازمت ۔ پُرزہ کو اپنے جُملوں میں استعمال کیجیے ۔



محنتی چیونٹی

یہ بھولی بھالی چیونٹی

پھرتی ہے دن بھر رات بھر ‏ ‏ ‏ کرتی ہے محنت کس قدر
جاتی ہے کھیتوں کی طرف ‏ ‏ ‏ لمبی قطاریں باندھ کر
پھر گھر پلٹ آتی ہے یہ
دانے اُٹھا لاتی ہے یہ
غلّے سے بھر لیتی ہے گھر ‏ ‏ ‏ کرتی ہے کیا لمبے سفر
یہ بھولی بھالی چیونٹی

رکھو کوئی شے ڈھانک کر ‏ ‏ ‏ مل جاتی ہے اس کو خبر
لے جاتی ہے یہ کچھ نہ کچھ ‏ ‏ ‏ وہ خشک شے ہو یا ہو تر
بُو سُونگھ کر بڑھتی ہے یہ
دیوار پر چڑھتی ہے یہ
جتنے ہیں ننھّے جانور ‏ ‏ ‏ اُن سب میں آتی ہے نظر
کیسی نرالی چیونٹی
یہ بھولی بھالی چیونٹی

محنت سے شرماتی نہیں مُشکل سے گھبراتی نہیں
کیسا ہی بھاری کام ہو کرنے سے اُکتاتی نہیں
رہتی نہیں بے کار یہ
ہے واقعی ہشیار یہ
سُستی اسے آتی نہیں سُستی اسے بھاتی نہیں
ہے عقل والی چیونٹی
یہ بھولی بھالی چیونٹی

(حفیظؔ جالندھری)

مشق

1- چیونٹی میں کون کون سی اچھّی عادتیں پائی جاتی ہیں ؟
2- شاعر نے چیونٹی کو عقل مند کیوں کہا ہے ؟
3- اس نظم میں گھر۔خبر کے ہم قافیہ الفاظ تلاش کیجیے اور اپنی طرف سے پانچ مزید الفاظ بھی لکھیے۔
4- حفیظؔ جالندھری نے بچّوں کے لیے نظمیں اور گیت لکھے ہیں ، ان کا مطالعہ کیجیے۔
5- چیونٹی کی عادات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجیے۔

لیاقت علی خاں

قائدِ ملّت لیاقت علی خاں پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم تھے۔ 16 اکتوبر 1951ء کی سہ پہر کو وہ ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے کے لیے راولپنڈی تشریف لائے۔ ابھی وہ تقریر کے لیے کھڑے ہی ہُوئے تھے کہ سیّد اکبر نامی ایک بدبخت شخص نے اُن پر گولی چلا دی اور وہ زخموں کی تاب نہ لا کر وفات پا گئے۔

قائدِ ملّت کی شہادت نے قائدِ اعظمؒ کی وفات کے زخم ہرے کر دیے۔ جب قائدِ اعظمؒ نے وفات پائی تو پاکستان ابھی اپنے پاؤں پر بھی کھڑا نہیں ہُوا تھا۔ بعض غیر ملکی اخباروں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ پاکستان اس شدید نقصان کو برداشت نہیں کر سکے گا لیکن قائدِ ملّت نے پاکستانی عوام کو بد دِل اور مایوس نہ ہونے دیا۔ بلکہ اپنی اَن تھک محنت، فرض شناسی اور بُلند ہمتی سے "بند مُٹھی" کی طرح انھیں ایک مرکز پر متّحد کر دیا۔ قائدِ اعظمؒ کے زرّیں اُصول "اتّحاد، یقینِ محکم اور تنظیم" ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہے۔ انھوں نے خُود بھی ان پر عمل کیا اور قوم کو بھی ان پر عمل کرنے کی نصیحت کی۔ جب وہ وزیرِ اعظم بنے تو حالات بہت ابتر تھے لیکن اُنھوں نے چار سال کی تھوڑی سی مُدّت میں سارے انتظامات درست کر دیے۔ پاکستان کی حفاظت کے لیے بہترین افواج تیّار کیں۔ دوست مُلکوں کے کامیاب دَورے کر کے قوموں کی برادری میں پاکستان کا نام اُونچا کر دیا۔ قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کی جو بنیادیں قائم کی تھیں، شہیدِ ملّت نے ان پر ایک مضبُوط اور مستحکم عمارت کھڑی کر دی۔

لیاقت علی خاں یکم اکتوبر 1895ء کو کرنال میں پیدا ہُوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں سے بی اے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے اِنگلستان چلے گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے بیرسٹری کی سند حاصل کی



قائدِ ملّت لیاقت علی خاں

1923ء میں برِّصغیر واپس آکر مُسلم لیگ میں شامل ہو گئے ۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ ہندوؤں اور انگریزوں نے مِل کر مُسلمانوں کو اُن کے جائز حقوق سے محروم کر رکھّا ہے ۔ مُسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا ایک ہی طریقہ تھا کہ سب مُسلمان مُسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے جان توڑ کوششیں کریں ۔

مُسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کو اُنھوں نے اپنی سیاسی زندگی کا مقصد بنا لیا اور اپنی ساری کوششیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیں ۔ اِس وقت قائدِ اعظمؒ کل ہند مسلم لیگ کے صدر تھے ۔ لیاقت علی خاں مُسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے اور پاکستان بننے تک اس عہدے پر کام کرتے رہے ۔ قائدِ اعظمؒ آپ پر بہت اعتماد کرتے تھے اور آپ کے کام سے خُوش تھے ۔

دسمبر 1943ء میں ایک موقع پر تقریر کرتے ہُوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا "لیاقت علی خاں میرے دستِ راست ہیں ۔ انھوں نے مُسلم لیگ کی تنظیم اور پاکستان کے قیام کے لیے دن رات کام کیا ہے ۔ جو بوجھ انھوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھایا ہے اس کا کوئی اور اندازہ نہیں کر سکتا ۔"

لیاقت علی خاں کو ایک طویل عرصے تک قائدِ اعظمؒ کے قریب رہنے کا موقع مِلا ۔ وہ اُن کے رفیق اور مزاج شناس تھے ۔ وہ ان کے ارادوں اور طریقِ کار سے واقف تھے ۔ اس لیے انھوں نے پاکستان کو اسی راستے پر آگے بڑھانے کی کوشش کی جِس پر قائدِ اعظمؒ اسے ترقّی دینا چاہتے تھے ۔ انھوں نے اپنی زندگی پاکستان ، اسلام اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر رکھّی تھی ۔ ایک بار اُنھوں نے بڑے پُرجوش انداز میں فرمایا کہ پاکستان کی عزّت ، حفاظت اور بقا کے لیے اگر خُون بہانے کی ضرُورت پیش آئی تو لیاقت کا خُون اس میں شامل ہو گا ۔ زمانہ گواہ ہے کہ اُنھوں نے اپنا قول سچ کر دکھایا ۔

لیاقت علی خاں کے سامنے ایک اہم مسئلہ پاکستان کے نئے آئین کی تیاری کا تھا ۔

مسلمان بجا طور یہ توقع رکھتے تھے کہ اب ان وعدوں کو پورا کیا جائے جو قیامِ پاکستان سے پہلے کیے گئے تھے۔ چنانچہ لیاقت علی خاں نے 17 مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی کے سامنے ایک قرار داد پیش کی، جس میں وضاحت کی گئی تھی کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں اور ہم اپنے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال کریں گے جن کی وضاحت قرآن وسُنّت میں کر دی گئی ہے۔ آئین کی بُنیاد آزادی، جمہوریت، مُساوات، انصاف اور رواداری کے اسلامی اُصولوں پر ہوگی اور یہاں ایک ایسا معاشرہ ترتیب دیا جائے گا جس میں ہر مُسلمان اپنی زندگی اسلامی اُصولوں کے مطابق بسر کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں کے غیر مُسلم باشندوں کو اپنے مذہب پر چلنے، اس کی حفاظت کرنے اور اپنی روایات کو ترقّی دینے کی پُوری آزادی ہوگی۔ اس قرارداد کا سارے پاکستان میں پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔

لیاقت علی خان کو طلبہ کے معاملات سے گہری دِلچسپی تھی۔ ایک موقع پر انھوں نے طلبہ سے خطاب کرتے ہُوئے فرمایا: "آپ اپنا سارا وقت علم حاصل کرنے کے لیے صَرف کریں اور اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں علم حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ ہمیں ہر شعبۂ زندگی میں ماہرین کی ضرُورت ہے۔ اگر آپ نے اپنا وقت علم حاصل کرنے میں صَرف نہ کیا تو پاکستان کو چلانے کے لیے ایسے ماہرین نہ مل سکیں گے جن کی ہمیں اشد ضرُورت ہے۔"

ایک موقع پر انھوں نے فرمایا "مَیں طلبہ سے کہوں گا کہ انھیں اعلیٰ کردار کا مالک بننا چاہیے۔ کردار کی مضبُوطی، دیانت داری اور خلُوص وہ خُوبیاں ہیں جو ہمارے محبُوب قائدِ اعظمؒ میں موجُود تھیں اور انھی خُوبیوں نے اُنھیں دُنیا کا ایک بہت بڑا اِنسان بنا دیا۔"

قائدِ ملّت کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی اور ان کی موت ایک شہید کی موت تھی۔

مشق

1 - ان سوالوں کے جواب دیجیے :-

(i) قائدِ ملّت نے پاکستان کو کس طرح مضبُوط بنایا؟

(ii) قائدِ اعظمؒ کی وفات کے وقت پاکستان کی کیا حالت تھی ؟

(iii) لیاقت علی خاں نے آئین کا مسئلہ کس طرح حل کیا ؟

(iv) قائدِ ملّت نے طلبہ کو کیا نصیحت کی؟

2- اعراب لگا کر تلفُّظ واضح کیجیے اور ان الفاظ کے معنی لکھیے :-

شدید - متحد - مستحکم - اعتماد - طویل - رفیق - بقا - خیر مقدم کرنا - حقوق - حدود - خلوص -

3- بدبخت - اَن تھک - حفاظت - خیر مقدم کرنا - صلاحیت - کردار کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے -

4 - اخبارات - عوام - انتظامات - افواج - حقوق - حدود - اختیارات اور طلبہ کے واحد تحریر کیجیے -

اگلا مورچہ


سوار محمدؐ حسین شہید

دسمبر 1971ء کے سرد دُھندلکے میں ایک جانباز مجاہد اوراس کے ساتھی پیٹ کے بَل رینگتے ہُوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ایسی سردی میں سانس روک کر پیٹ کے بَل رینگنا آسان نہ تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ ایک پتّا بھی کھڑکا تو دُشمن بھڑک اُٹھے گا۔ ذرا سی آہٹ پر دُشمن کی توپوں کے دہانے آگ اُگلنے لگیں گے۔ اور یہاں وہاں چھُپے ہُوئے دُشمن کی سٹین گنیں اُن پر گولیاں برسانا شرُوع کر دیں گی۔ ان تمام خطروں کے باوجُود وہ انتہائی احتیاط اور ہوشیاری سے کسی ایسے ٹھکانے کی تلاش میں تھے جہاں وہ اپنے لیے ایک محفُوظ اور مضبُوط مورچہ تیار کر سکیں تاکہ ایک طرف دُشمن کے ارادوں کی خبریں اپنی فوج کو دے سکیں اور دُوسری طرف دُشمن کو بوکھلا کر اس کے قدم اُکھاڑ دیں۔ وہ جُوں جُوں آگے بڑھ رہے تھے، خطرہ ان سے قریب ہو رہا تھا۔ لیکن ان کو اس کی پروا ہی کب تھی! وہ اس خطرے ہی کو تو اپنی سرحدوں سے دُور رکھنے کے لیے دُشمن کے اِس علاقے میں گھُس آئے تھے جہاں وہ حملے کی پُوری تیاریاں کیے آگے بڑھنے کو تیار بیٹھا تھا۔

آہٹ اور کھٹکے کے خیال سے وُہ ایک دُوسرے سے بات بھی نہ کر سکتے تھے۔ صرف آنکھوں اور گردن کے اشاروں ہی سے کام لے سکتے تھے۔ اپنی جانیں ہتھیلی پر

رکھ کر اس خطرناک علاقے میں گھس آنے والے جانباز جوانوں کی نظریں گھنی بھنوّوں، موٹی آنکھوں والے اس تنومند جوان کی طرف لگی ہوئی تھیں جو اُن کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کے اشارے کے منتظر، وہ درختوں اور گھنی جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ یکایک اُن کا راہنما ایک جگہ پہنچ کر رُک گیا۔ اس کی گھنی بھنوّوں کے نیچے اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ اس کے اشارے پر اس کے ساتھیوں نے آگے بڑھنا بند کر دیا۔

اِدھر اُدھر دیکھ کر اچھّی طرح اطمینان کر لینے کے بعد کہ اُن پر کسی کی نظر نہیں پڑے گی، اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ اس کے اشارے پر وہ سب مِل کر ایک مضبُوط مورچے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ایک ایک پَل اور ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ لیکن یہ کام انھوں نے اس پھُرتی اور ہوشیاری سے کیا کہ خُود ان کو بھی یقین نہ آتا تھا۔ مورچہ تیار کر لینے کے بعد اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ڈٹ کر وہاں بیٹھ جائیں اور خُود دُشمن کے ٹھکانوں اور تیاریوں کا کھوج لگانے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ یہ نوجوان شکر گڑھ (سیالکوٹ) کے محاذ پر پاکستانی فوجوں کے بکتر بند دستے کا سوار مُحمّد حسین تھا جو عہدے کے لحاظ سے جیپ ڈرائیور تھا۔ پاکستان کی سرحدوں پر جنگ چھِڑ چکی تھی۔ چھ سال کے عرصے میں یہ دُوسری جنگ تھی جو پاکستانی قوم کو اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے لڑنا پڑی۔

سوار محمد حسین گوجر خاں ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1944ء میں انھوں نے فوج میں ملازمت کر لی۔ یہی وہ سوار مُحمّد حسین تھے جو ایک بے قرار روح کی طرح دُشمن کے ٹھکانوں اور ارادوں کا کھوج لگا کر دُشمن کے علاقے ہرڑ خورد میں گھُوم رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ اس علاقے میں چپّے چپّے پر دُشمن پُوری تیاریوں کے ساتھ موجُود ہے۔ قدم قدم پر بارُودی سُرنگیں بچھی ہُوئی ہیں اور اُن پر ایک قدم بھی پڑ گیا تو ان کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔ لیکن یہ خطرہ اُنھوں نے خُود ہی تو مول لیا تھا ورنہ ان کا تعلق

تو بکتر بند دستے سے تھا اور جنگ میں یہی دستہ سب سے زیادہ محفُوظ خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اس کا کام لڑنے والی فوجوں کو سامان پہنچانا ہوتا ہے۔ جنگ چھڑ جانے کے بعد دو دن تک وُہ یہی فرض انجام دیتے رہے، لیکن ان کی روح کسی معرکے کے لیے بے قرار تھی۔ ان کو معلُوم تھا کہ دُشمن اپنا پُورا دباؤ اس محاذ پر ڈالنے والا ہے اور ایسے وقت میں دُشمن کے علاقے میں گھُس کر پُل پُل کی خبر لانا ضرُوری ہے۔ یہ کام بے حد مشکل اور اہم ہے۔ جنگ کے سارے نقشے اور فتح یا شکست کا دارومدار اسی کام پر ہوتا ہے۔ اس کام کو بہت ہوشیاری اور انتہائی مستعدی سے کرنا پڑتا ہے اور سوار محمدؐ حسین کو یقین تھا کہ اُس کام کو وہ بہتر سے بہتر طریقے پر انجام دے سکتے ہیں۔ پانچ دسمبر تک انھوں نے اپنے افسرِ اعلیٰ سے بار بار درخواست کی تھی کہ انھیں اس کام پر جانے کی اجازت دی جائے لیکن ہر بار ان کے افسر نے کہا کہ تُم جو کچھ کر رہے ہو وہ بھی بہت اہم کام ہے۔ اس تمام عرصے میں محمدؐ حسین کی بے قراری اور بھی بڑھتی گئی۔

شکر گڑھ کے علاقے پر دُشمن کا دباؤ اور خطرہ بڑھ رہا تھا اور واقعی دُشمن کی پَل پَل کی خبر ملنا بے حد ضرُوری تھا، چنانچہ جب لانسرز کو حُکم ملا کہ وُہ دُشمن کے علاقے میں بیس کلومیٹر تک گھُس جائیں تو ان کے افسر نے فیصلہ کر لیا کہ محمدؐ حسین کو یہ فرض سونپ کر ان کی خواہش پُوری کر دی جائے۔ محمدؐ حسین اپنے تین ساتھیوں سمیت پانچ دسمبر کو اس مہم پر روانہ ہُوئے۔ نو دسمبر تک انھوں نے انتہائی پھُرتی اور مستعدی سے دُشمن کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ دُشمن حیران تھا کہ وُہ آخر ہیں کہاں؟ اپنے مورچے میں بیٹھ کر لگاتار گولیاں برسانے، دُشمن کی اچھّی خاصی تعداد کو موت کے گھاٹ اُتارنے اور اپنے ساتھیوں کو مورچے میں ڈٹے رہنے کی ہدایت کرنے کے بعد محمدؐ حسین اور بھی زیادہ مُشکل کام کی طرف متوجّہ ہُوئے۔ اب وہ دُشمن کے اہم ٹھکانوں کا پتا لگاتے، اپنے افسر کو سگنل پر ان کی خبر دیتے اور کبھی خُود چھپلے مورچوں پر جا کر مُسلسل گولہ باری کرواتے رہے۔ نو دسمبر تک دُشمن کے قریباً ڈیڑھ درجن ٹینک تباہ ہو چکے تھے اور وہ رُوسی ساخت کے جدید ترین بے شمار اسلحہ کے باوجُود پاکستانی سرحد

کی طرف قدم نہ اُٹھا سکا۔ سوار محمدؐ حسین کی کامیاب مخبری نے دُشمن کو حیران کر رکھا تھا اور اُسے اس مجاہد کا کہیں کھوج نہ مِلتا تھا۔ دُشمن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ انسان ہے یا چھلاوہ، جو دونوں طرف آگ اُگلتی ہُوئی توپوں اور سنسناتی ہُوئی گولیوں کی بوچھاڑ میں اِتنا چوکس، اِتنا چوکنّا ہو کر اپنا کام کر رہا ہے۔ نو دسمبر کی شام تک دُشمن زِچ ہو کر رہ گیا۔لیکن یہ وقت نہ صِرف پاکستان کی سرحد بلکہ محمدؐ حسین پر بھی بھاری تھا۔

دُھند کی شِدّت کے علاوہ نالا پانی سے بھر گیا تھا اور دُشمن کی کارروائیوں کا اندازہ لگانا مُشکل ہو رہا تھا۔ ایک لحظے کو محمدؐ حسین کی آنکھیں بھی بھر آئیں یہی تو وقت تھا جب دُشمن کی بھرپُور کارروائیوں سے اپنی فوج کو باخبر رکھنا ضروری تھا۔مُلک کی سرحد کی جانب خطرہ بڑھ رہا تھا۔ ایک بار انھوں نے اپنی سرحدوں کی طرف نظر اُٹھائی گویا کہتے ہوں: "اطمینان رکھنا! سوار محمدؐ حسین جب تک زندہ ہے، دُشمن ایک قدم آگے نہ بڑھ پائے گا۔"

مُشکلات سے ہار مان لینا محمدؐ حسین کی فطرت میں نہ تھا۔انھوں نے نالا پار کیا اور عین اس علاقے میں گھُس گئے جہاں دُشمن کی بھاری اکثریّت موجُود تھی ۔ رکاوٹیں اور مُشکلات پاکستان کے اس جیالے بیٹے کے آگے کیا حقیقت رکھتی تھیں۔ وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دُشمن کے ہر ہر اڈّے اور ٹھکانے کا پتا اپنے توپ خانے کو دیتے اور مسلسل گولہ باری کرواتے،ساتھ ہی مورچے میں بیٹھے اپنے ساتھیوں سے بھی گولیاں برسواتے اور نعرۂ تکبیر لگا لگا کر ان کے دلوں کو گرماتے رہے۔آخر ان کی شہادت کا وقت قریب آگیا۔ دُشمن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زبردست کھوجی، جس نے پانچ دسمبر سے لے کر نو دسمبر تک اس کی ساری قوتوں کو شل کر کے رکھ دیا ہے، کہاں چھُپا ہُوا ہے۔چنانچہ گولیوں کی ایک باڑھ آئی اور پاکستان کے اس انمول بیٹے کے سینے کو چیرتی ہُوئی نِکل گئی۔ گرم گرم جوان لہُو کی ایک دھار نِکل کر مٹّی میں جذب ہو گئی۔ انھوں نے ایک بار اپنا سر اُٹھا کر سرحد کی طرف

دیکھا اور پھر زمین پر رکھ دیا۔ انھوں نے اپنا فرض اور وعدہ پُورا کر دیا تھا۔ وہ بہت تھک گئے تھے، انھیں آرام کی ضرُورت تھی اور اب وہ ہمیشہ کی نیند سو گئے تھے۔ قوم نے شہید کی بے مثال جرأت اور خدمات کا اعتراف ان کو پاکستان کا سب سے بڑا اِعزاز "نشانِ حیدر" دے کر کیا۔

مُحمّد حسین کی شہادت پاکستانی قوم اور اس کی سرحدوں کے لیے حفاظت کا پیمان بن گئی ہے۔ جب تک قوم میں مُحمّد حسین جیسے بیٹے موجُود ہیں، وطن کی سرحدیں محفُوظ رہیں گی۔

مُحمّد حسین کے بُوڑھے باپ نے بیٹے کی شہادت کا سُن کر کہا:

"مُحمّد حسین میرا اکلوتا بیٹا اور خاندان کا واحد سہارا تھا۔ شُکر ہے کہ اُس نے وطن اور اسلام کی لاج رکھ لی۔ مجھے خُوشی ہے تو اس بات کی کہ میرے بیٹے نے میدانِ جنگ میں پیٹھ پر نہیں، شیر کی طرح سینے پر گولی کھائی ہے۔"

کتنے خُوش نصیب ہوتے ہیں وہ ماں باپ جن کے گھر میں مُحمّد حسین جیسے بیٹے پیدا ہوتے ہیں۔

مشق

1۔ پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز کون سا ہے؟

2۔ "نشانِ حیدر" کن لوگوں کو دیا جاتا ہے؟

3۔ سوار مُحمّد حسین کی خواہش کیا تھی؟

4۔ سوار مُحمّد حسین نے کون سا کارنامہ انجام دیا؟

5۔ آپ کسی اور ایسے شہید کے حالات بھی پڑھیں جسے "نشانِ حیدر" کا اعزاز ملا ہو۔

6۔ سبق میں سے مُشکل الفاظ چُن کر فہرست بنائیے اور اُن کے معنی اُستاد صاحب سے پُوچھ کر لکھیے۔

7۔ 1965ء کی جنگ کا کوئی مشہُور واقعہ اپنی کاپی میں لکھیے۔

8۔ آپ اپنے مُلک کی حفاظت کے لیے کیا کُچھ کرنا چاہتے ہیں؟ سادہ لفظوں میں بیان کیجیے۔



ہَوا



ہَوا جاں دار کو رکھتی ہے زندہ
ہَوا کے بَل پہ اُڑتا ہے پرندہ
ہَوا آواز کو پہنچائے ہر جا
ہَوا ہو گی، جہاں کچُھ بھی نہ ہوگا

کوئی خالی جگہ خالی نہیں ہے
ہَوا کا دَور دورہ ہر کہیں ہے

کبھی دَم سادھ کر گُم سُم رہے گی
کبھی پُروا، کبھی پچھوا بنے گی
کبھی اٹکھیلیاں کرتی ملے گی
کبھی آندھی کی صُورت میں چلے گی

جھلائے گی کبھی شاخوں کو جھُولا
کبھی بن جائے گی اُٹھتا بگُولا

ہَوا جب گرم ہو، ہوتی ہے ہلکی
جو ہلکی ہو، تو اُوپر کو ہے اُٹھتی
جگہ لینے کو پھر اس کی، ہوا ہی
بڑی تیزی سے اس جانب ہے بڑھتی

یہی وصف اس کا لائے سرد جھونکے
اسی سے خاک اُڑے، طوفان اُٹھے

ہَوا کو جس جگہ ، جِس طوَر دیکھو
ہَوا بے رنگ ہے ، خالص اگر ہو
ہَوا کا وزن ہے ، اس کو جو تولو
ہَوا پھیلے گی ، پچکے گی ، یہ جانو
ہَوا ہنستی بھی گاتی بھی ملے گی
اگر گیسوں کی صُورت میں رہے گی

(قیوم نظر)

مشق

1 - اس نظم میں ہوا کے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں ، انھیں ترتیب وار لکھیے۔

2 - چوتھے بند کو پڑھ کر بتائیے کہ آندھی کسے کہتے ہیں ؟

3 - ان لفظوں کے معنی بتائیے اور انھیں جملوں میں استعمال کیجیے :-

بل پڑ - دور دورہ - دم سادھنا - گُم سُم - پچھوا - اٹھکیلیاں - بگولا - وصف - بے رنگ ، خاک اُڑانا -

4 - اس نظم سے ایسے افعال کی فہرست بنائیے جن میں آنے والا زمانہ پایا جاتا ہو۔

5 - ہوا کی مختلف صُورتوں کے بارے میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کی فہرست بنائیے۔

بڑا بھائی

دوپہر کا وقت تھا، لُو چل رہی تھی۔ سڑکوں اور بازاروں کی رونق کم ہو گئی تھی البتہ بس سٹاپ پر بہت ہجوم تھا۔ سٹاپ کے قریب گنڈیری والوں اور شربت بیچنے والوں کی خُوب بِکری تھی۔ دُھوپ میں کھڑے بَس کا انتظار کرنے والے مسافر اپنی پیاس بجھانے کے لیے گنڈیریاں اور شربت کے گلاس خرید رہے تھے۔ ان کی نظریں اس راستے کی طرف لگی ہُوئی تھیں جِدھر سے بس آنے والی تھی۔

بس کا انتظار کرنے والوں میں اظہر بھی شامل تھا۔ اُس کو رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ آج بہت دیر ہو گئی ہے، میری امّی بہت پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اِتنے میں بس کا اگلا حِصّہ چوک کے اُس طرف سے نمودار ہوا۔ بَس دِھیرے دِھیرے سٹاپ کی طرف بڑھنے لگی تو اظہر کا



دِل بُجھ گیا۔ بَس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہُوئی تھی۔ جیسے ہی بَس رُکی، مُسافر لپکے اور جُوں توُں کرکے اُس پر چڑھ گئے۔ صِرف اظہر اور اُس کا دوست رہ گئے۔ بس چلنے ہی کو تھی کہ وہ دونوں پائیدان کے ساتھ والا ڈنڈا پکڑ کر بس کے ساتھ لٹک گئے۔ کنڈیکٹر نے منع بھی کیا کہ اگلی بس کا انتظار کرلو، یہ خطرناک حرکت ہے، لیکن اظہر نے اس کی ایک نہ سُنی اور اس طرح لٹکا رہا۔

بَس میں جگہ حاصل کرنے کے لیے مسافروں میں کش مکش ہو رہی تھی کہ ایک دھکّا لگا اور اظہر کا ہاتھ ڈنڈے پر سے پھسل گیا اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ زمین پر آرہا۔ کنڈیکٹر اور مسافر اُس کے اِرد گرد جمع ہو گئے۔ گرمی، چوٹ، لوگوں کی بِھیڑ اور پیاس کی شِدّت سے وُہ قریباً بے ہوش ہُوا جا رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے سہارا دے کر اُس کو اُٹھانا چاہا تو دَرد کی شِدّت سے اظہر کی چیخ نِکل گئی۔ اس کا بایاں بازُو بُری طرح جھُول رہا تھا۔ کنڈیکٹر گھبرا گیا۔ ارے! اِس بچّے کی تو ہڈّی ٹُوٹ گئی ہے! مسافروں کو گرمی ستا رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ بس جلدی روانہ ہو تاکہ اپنے ٹھکانوں پر پہنچ سکیں۔ وہ اس کو طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے۔ ایک بڑی بی اسے چمکار کر بولیں: "اے بیٹے! ہمّت کر کے اندر سیٹ پر بیٹھ جا کہ بس تو چل سکے۔ اُف توبہ کیسی گرمی ہے۔"

اسی وقت کالج کا ایک طالب علم آگے بڑھ کر بولا: "اگر اس کا بازو یوں ہی جھُولتا رہا تو بَس کے ہر جھٹکے پر اسے تکلیف ہوگی اور ہڈّی کا ٹُوٹا ہُوا سِرا غلط جانب ہو جانے کا خطرہ بھی ہے۔"

پھر وہ اظہر کے قریب بیٹھ گیا اور اس کا بازُو چھُوتے ہُوئے بولا "لاؤ میں تُمھارے بازُو کی عارضی پٹّی کیے دیتا ہوں۔" اُس نے اپنی کاپی کی جلد توڑ کر اس کا گتّہ نکالا اور اس کو موڑ کر لکڑی کی کھپچّی کی طرح کرلیا۔ پھر اپنے کُرتے کی جیب سے ایک پٹّی نکالی۔ اظہر کے بازو کو پکڑ کر مہارت اور نرمی سے اس طرح دبایا کہ ہڈّی کے ٹُوٹے ہُوئے سِرے ٹھیک جگہ پر آکر مِل گئے۔ پھر پٹّی باندھ دی۔ طالب علم نے مسافروں سے دو تین رُومال لیے،

اُن کو آپس میں گرہیں لگا کر ایک تکونی پٹّی بنائی۔ اِس کو گرہ دے کر اظہر کے گلے میں ڈالا اور بڑے آرام سے بازُو اِس کے سہارے پر رکھ دیا۔

اظہر کو سکُون سا آگیا تھا۔ طالبِ علم نے پاس کھڑے شربت والے سے شربت کا ایک گلاس لے کر اظہر کو پلایا اور کہنے لگا "چلو میں تم کو گھر تک پہنچا آؤں"۔ بَس روانہ ہو گئی۔ طالبِ علم نے ایک رکشا روکا اور اظہر کو اس میں بٹھا لیا۔ اظہر کہنے لگا "بھائی جان میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت ہُوئی"۔ طالبِ علم نے جواب دیا "نہیں بھائی! یہ تو میرا فرض تھا"۔ اظہر نے پُوچھا "بھائی جان! کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟" طالب علم نے جواب دیا: "نہیں بھائی مَیں ڈاکٹر نہیں مَیں تو سکاؤٹ ہوں، ہمیں ابتدائی طبّی اِمداد کی تربیت بھی دی جاتی ہے"۔

اظہر نے پُوچھا "ابتدائی طبّی اِمداد کا کیا مطلب ہے؟" طالب علم بولا "ابتدائی طبّی امداد کا مطلب ہے حادثوں یا وباؤں میں فوری طور پر انسانوں کی مدد کرنا"۔ اظہر کہنے لگا: "اچھا تو آپ ہر تکلیف کا عِلاج کر لیتے ہیں؟"

طالبِ علم نے ہنس کر جواب دیا: "نہیں بھئی علاج تو ڈاکٹر صاحب ہی کرتے ہیں، ہمارا کام تو مریض کی عارضی دیکھ بھال کرنا اور پُوری طبّی اِمداد ملنے تک اس کی حالت کو سنبھالے رکھنا ہے"۔ اظہر کہنے لگا: "بھائی جان آپ نے میرا بازُو باندھنے کے لیے اپنی جیب سے جھٹ پٹّی نکال لی۔ کیا آپ کو پتا تھا کہ آپ کو راستے میں کسی کی پٹّی کرنی پڑے گی؟"

طالبِ علم اس کے سوال پر ہنس پڑا: "بھائی یہی تو ہماری تربیت کا مقصد ہے کہ ہم ہمیشہ اور ہر جگہ ایسے حادثوں کے لیے تیار رہیں۔ اب دیکھو نا خطرہ تو ہر وقت اور ہر جگہ انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے"۔ اظہر ہنسا اور بولا "ہاں جیسے میں بس کے ساتھ لٹکے ہُوئے گر گیا"۔

طالبِ علم نے کہا "اظہر میاں! اس میں خطرے سے زیادہ خُود تمھاری خطا تھی۔

اس طرح چلتی بس میں لٹکنا خطرے سے خالی نہیں۔ وہ تو کہو خیر ہوگئی۔ بس کی رفتار کم تھی ورنہ خدا جانے کتنی چوٹ آتی۔" اظہر نے پھر پوچھا: "آپ کن کن حادثوں میں لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں؟" طالب علم بولا "ہر قسم کے حادثوں میں۔ کوئی زخمی ہو جائے، تمھاری طرح اپنی ہڈی توڑ لے، ڈوب کر بے ہوش ہو جائے، لُو لگ جائے یا جل جائے، ہمیں ان تمام حادثوں کے شکار مریضوں کو دُکھ درد سے فوری نجات دلانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر ٹیکا لگانا بھی سکھایا جاتا ہے۔" اظہر اچھل پڑا "ارے بھائی جان! آپ لوگ میدانِ جنگ میں بھی کام کر سکتے ہیں؟" طالبِ علم نے اظہر کو بتایا: "میدانِ جنگ ہی میں تو سب سے زیادہ اس اِمداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ابتدائی طبی اِمداد کے باقاعدہ دستے لڑنے والے دستوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور پوری طبی امداد ملنے تک زخمیوں کو سنبھالے رکھتے ہیں۔ مریض کو اِدھر سے اُدھر لے جانا ہو تو وقت پڑنے پر تین آدمیوں کی مدد سے انسانی سٹریچر تیار کر لیتے ہیں۔"

اظہر جو بڑی بے چینی سے بات ختم ہونے کا اِنتظار کر رہا تھا، جلدی سے بولا "بھائی جان! جنگ کے زمانے میں تو آپ لوگوں کی بڑی ضرورت ہوتی ہوگی۔" طالب علم نے کہا: "ہاں شہری دفاع والوں کو بھی ہماری ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اظہر میاں! جنگ ہو یا امن، ہمارا کام دُکھ درد میں مُبتلا اِنسانوں کی جھٹ پٹ امداد کرنا ہوتا ہے۔" رکشا اب اظہر کے گھر کے قریب رُک گیا تھا۔ اظہر کہنے لگا: "بھائی جان! میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔" طالبِ علم نے مُسکرا کر کہا "اِس طرح کہ تم بھی ابتدائی طبی اِمداد کی تربیت حاصل کر کے دُوسروں کی مدد کرو۔" اظہر نے کہا: "اچھا بھائی جان! اب مجھے ایک بات اور بتا دیں۔"

"وہ کیا بات ہے؟" طالبِ علم نے پوچھا۔

اظہر نے کہا: "آپ کا نام کیا ہے؟"

طالب علم نے جُھک کر اظہر کے سر پر پیار کیا اور محبت سے بولا" تمُھارا بڑا بھائی"۔ پھر وہ کہنے لگا: "یاد رکھّو! ہر بڑا طالب علم چھوٹے طالب علم کا بڑا بھائی ہوتا ہے"۔

مشق

1- (i) اظہر نے کیا غلطی کی اور اس غلطی کی اسے کیا سزا ملی؟

(ii) سکاؤٹ نے اظہر کو کس طرح پٹی باندھی؟

(iii) اظہر نے سکاؤٹ کا نام پُوچھا تو اُس نے کیا جواب دیا؟

(iv) بڑے بھائی نے شکریہ ادا کرنے کا کیا طریقہ بتایا؟

2- ابتدائی طبّی امداد کے بارے میں آپ نے جو کُچھ اس سبق میں پڑھا ہے، اُسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

3- "دھیرے دھیرے" کی طرح کے کچُھ اور مرکب بنائیے۔ جیسے "ہولے ہولے"۔

4- دل بجُھ جانا۔ کھچا کھچ۔ ایک نہ سُننا۔ کش مکش ہونا۔ سکون آنا۔ دیکھ بھال کرنا کو جُملوں میں استعمال کیجیے۔

5- گرم۔ دیر۔ قریب۔ درست۔ تکلیف۔ عارضی کے متضاد الفاظ لکھیے۔

برسات

جو سُوکھی زمیں پہ ترشّح ہُوا
نکلتی ہے بُو سونْدھی سونْدھی سی کیا

گرجتے ہیں بادل، چمکتی ہے بَرق
ہُوا صحن کا صحن پانی میں غرق

گئی نیند اُچَٹ پانی کے شور سے
بہی جاتی ہیں نالیاں زور سے

ہَوا زور سے چلتی ہے بار بار
پہنچتی ہے کمروں کے اندر پھوہار

بنا ہے جو وہ ٹین کا سائباں
ہے اس وقت ارگن کا اس پر گماں

چٹانوں پہ کیا لُطفِ نظّارہ ہے
کہ جو بُوند ہے ایک فوّارہ ہے

چلی آتی ہے بدلیوں کی قطار
ہَوا کے ہیں گھوڑے پہ بادل سوار

دھواں دھار اس وقت چھایا ہے ابر
فلک پر سیہ مست آیا ہے ابر

اُٹھی شاخِ گُل سبزے کو چُوم کر
برستی ہے کیا کیا گھٹا جھُوم کر

وہ آموں کے اشجار پر سامنے
کوئی کُوکتا ہے بڑے زور سے

یہ ہے اس صدا کا اثر کان پر
کہ دِل ٹوٹ جاتا ہے ہر تان پر

ادھر کہ رہا ہے کوئی پی کہاں
سُنا یہ تو قابُو میں پھر جی کہاں

کہیں کوئی چِلّا رہا ہے کہ ہاں
ذرا دیکھنا اِس گھڑی کا سماں

پَروں کو سمیٹے ہُوئے وہ طیور
درختوں پہ بیٹھے ہیں کیا دُور دُور

(بے نظیر شاہ)

مشق

1- برسات کا منظر اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

2- چوتھے، پانچویں اور ساتویں شعر کی نثر بنائیے۔

3- اعراب لگا کر مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفُّظ واضح کیجیے اور ان کے معنی بھی لکھیے:-

ترشح - برق - لطف نظارہ - فوارہ - فلک - اشجار - طیور۔

4- مندرجہ ذیل کو اپنے جُملوں میں استعمال کیجیے:-

نیند اچٹنا - ہَوا کے گھوڑے پر سوار ہونا - سوندھی سوندھی - دھواں دھار - دل ٹوٹ جانا - دُور دُور۔

5- مندرجہ ذیل کے چار چار ہم آواز الفاظ لکھیے:-

زور - کان - کہاں - جھوم۔

خُوشی کا راز

صُبح کا وقت تھا۔ بچّے سکُول جانے کی تیّاری کر رہے تھے۔ گھر میں ایک اُودھم مچا ہُوا تھا۔ سب سے زیادہ شور شکیلہ مچا رہی تھی۔ اس کی کتابیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ جغرافیے کی کاپی کے صفحے پھاڑ کر بچّوں نے کشتیاں اور ہوائی جہاز بنا لیے تھے۔ بڑی مُشکل سے قلم ڈھونڈا تو معلوم ہُوا کہ اس کی نِب ٹُوٹ گئی ہے۔ شکیلہ نے رونا شرُوع کر دیا اور قلم ہاتھ میں لیے اپنی امّی کے پاس آئی: "امّی جی! دیکھیے میرا قلم اشرف نے توڑ دیا۔" امّی باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ اُنھوں نے کہا: "بیٹی! تم سکُول سے آتی ہو تو بستہ اور کپڑے یوں پھینک دیتی ہو جیسے تُمھارا ان سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ تُمھاری دیکھا دیکھی چھوٹے بھائی بہنوں کی عادت بھی بگڑ گئی ہے۔ دیکھو تو گھر کی حالت کیسی بنی رہتی ہے۔ مَیں اکیلی کیا کیا کروں۔ ذرا دیکھو تو بال کیسے بکھیر رکھّے ہیں۔ اب تک کنگھی بھی نہیں کی۔ بس نِکل گئی تو کیا کرو گی؟"

اِس دن شکیلہ کا ٹسٹ تھا۔ بس نِکل جانے کا سُن کر وُہ گھبرا گئی اور جلدی جلدی کتابیں بستے میں ٹھونس، ناشتہ کیے بغیر ہی روانہ ہو گئی۔

اس کی ہم جماعت لڑکیوں نے اس کی حالت دیکھ کر اس کا مذاق اُڑایا اور پُوچھنے لگیں: "شکیلہ! کیا بستر سے نِکل کر سیدھی سکول چلی آئی ہو؟" شکیلہ گھر سے بھُوکی آئی تھی اِس لیے ٹسٹ بھی ٹھیک نہ ہو سکا۔

شکیلہ گھر آئی تو گھر کی حالت دیکھ کر اور بھی پریشان ہو گئی۔ برآمدے میں جھوٹے برتن بکھرے ہُوئے تھے۔ ان پر مکھّیاں بھِنک رہی تھیں۔ صحن میں میلے کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ مّی کو کھانا پکانے اور دُوسرے کاموں سے فرصت ہی نہ ملی تھی جو گھر کی صفائی کرتیں۔

شکیلہ صحن میں چلی گئی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ بنی ہُوئی کیاریوں کے پودے پانی نہ ملنے سے سُوکھ رہے تھے۔ امّی شکیلہ کو دیکھتے ہی بولیں: "شکیلہ! ذرا گھر کی حالت دیکھو، تم ہر روز اپنی چیزیں بکھری چھوڑ کر چل دیتی ہو۔ آج مَیں نے تُمھاری بکھری ہُوئی چیزیں اسی طرح پڑی رہنے دی ہیں تاکہ تم دیکھو کہ اگر بچّے گھر کی صفائی کا خیال نہ رکھیں تو وُہ کتنا بُرا لگتا ہے۔"

شکیلہ کا دل اُداس ہو گیا۔ وُہ کمرے میں جا کر کھڑکی کے قریب کھڑی ہو گئی۔ سامنے سلمیٰ کا گھر تھا۔ اس کے گھر کی کھڑکیوں کے شیشے چمک رہے تھے۔ دیوار پر قرینے سے چڑھی ہُوئی بیل میں پھُول مُسکرا رہے تھے۔ وُہ سوچنے لگی سلمیٰ کتنی خُوش نصیب ہے۔ وُہ مُجھ سے زیادہ تندرست اور خُوش رہتی ہے، اس کا گھر کتنا پُرسکون نظر آتا ہے حالانکہ ہمارے گھر بالکل ایک ہی جیسے ہیں۔

اتّفاق کی بات ہے کہ دُوسرے دن سلمیٰ نے کہا: "شکیلہ! تُم سے کتنی بار کہا ہے کہ امّی سے اجازت لے کر میرے گھر آؤ۔"

شکیلہ بولی: "اجازت تو مَیں نے لے لی تھی۔ چلو آج مَیں تُمھارے ساتھ چلتی ہُوں۔"

سلمیٰ کا گھر اندر سے بھی صاف سُتھرا اور پُرسکون تھا۔ اس کے گھر کی کیاریوں کے پودے ہرے بھرے تھے اور ان میں پھُول لگے ہُوئے تھے۔

سلمیٰ نے گھر پہنچتے ہی سکُول کے کپڑے اُتار کر دُوسرا لباس پہنا، ہاتھ منہ دھو کر صاف سُتھری کشتی میں کھانا لگا کر لائی۔ دونوں نے مل کر کھانا کھا لیا تو سلمیٰ نے جھٹ پٹ جھوٹے برتن صاف کر کے الماری میں رکھ دیے۔

سلمیٰ کی امّی نے آواز دے کر کہا: "سلمیٰ بیٹی! دیکھو تو آندھی سے برآمدے میں گرد آ گئی ہے۔ ذرا صاف تو کر دو۔" سلمیٰ نے جھاڑو اُٹھا کر برآمدے کی گرد صاف کر دی۔

شکیلہ نے سلمیٰ سے کہا: "سلمیٰ تم جھوٹے برتن بھی خُود ہی صاف کرتی ہو اور جھاڑو بھی

خُود ہی دیتی ہو۔ مجھے تو ایسے کام کرتے شرم آتی ہے۔" سلمیٰ بولی: "شکیلہ! اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ شرم کی بات تو یہ ہے کہ گھر مَیلا اور اُلٹا پلٹا پڑا رہے۔ میری امّی تو کہتی ہیں، اپنے ہاتھ سے کام کرنا سُنّت ہے۔ ہمارے پیارے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم اپنے تمام کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے اور ان کی صاحبزادی حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے گھر کے کام آپ ہی کرتی تھیں۔ چکّی تک خُود چلاتی تھیں۔"

صفائی سے فارغ ہو کر سلمیٰ نے ایک بالٹی میں صابن کا جھاگ بنایا اور کپڑے دھونے بیٹھ گئی تو شکیلہ نے سلمیٰ سے کہا: "اچھا اب اجازت دو! امّی میری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

رات کو شکیلہ اپنی امّی کے قریب لیٹی تو کہنے لگی: "امّی وُہ جو سلمیٰ ہے نا، وُہ اپنے گھر میں جھاڑو خُود دیتی ہے اور میں نے ٹوکا تو کہنے لگی: پھر کیا ہُوا حضرت بی بی فاطمہؓ بھی تو اپنا سارا کام خُود کرتی تھیں اور کہنے لگی، وہ تو چکّی میں آٹا بھی خُود پیستی تھیں۔" شکیلہ کی امّی نے کہا: "ہاں شکیلہ سلمیٰ سچ کہتی ہے ہمیں اپنے کاموں کے لیے دُوسروں کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ بی بی فاطمہؓ کو اُن کے بابا یعنی ہمارے رسُولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے ایسی ہی تربیت دی تھی۔ آپؐ اپنا ہر کام خُود کرتے اور اپنی اُمّت کو بھی یہی سکھاتے۔ حضرت ابوبکرؓ اپنی خلافت کے زمانے میں اپنا ہر کام کرتے تھے اور کہتے تھے: "میرے آقا اور میرے دوست رسولِ اکرمؐ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ اپنے کام کے لیے دُوسروں کو تکلیف نہ دینا۔"

شکیلہ سوچ میں پڑ گئی اور بولی: "تب تو اپنے ہاتھ سے کام کرنا بڑی اچھی بات ہے۔"

امّی نے کہا: "ہاں بیٹی اپنا کام خُود کرنے والا ہمیشہ خُوش اور تندرست رہتا ہے۔"

شکیلہ نے کہا: "اسی لیے سلمیٰ ہم سب لڑکیوں سے زیادہ تندرست اور خُوش رہتی ہے اور اس کا گھر بھی صاف سُتھرا رہتا ہے۔"

دُوسرے دن شکیلہ سکول سے آئی تو اس کی امّی یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ اُس نے

سکوُل سے آتے ہی کپڑے تبدیل کیے۔ اپنا کھانا خوُد اُٹھا کر لائی اور کھانا کھاتے ہی برتن صاف کیے، گھر کی صفائی کی۔ چند ہی دن میں شکیلہ کا گھر بھی سلمٰی کے گھر کی طرح صاف سُتھرا اور پُرسکون نظر آنے لگا۔ اس کے صحن کی کیاریوں کے پودے سرسبز ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پھوُلوں سے لد گئے۔ شکیلہ اب بہت خوُش اور تندرست نظر آتی ہے اس لیے کہ اب اس نے سُستی اور کاہلی کی عادت چھوڑ کر اپنے کام خوُد کرنے شروُع کر دیے ہیں۔ یہی اس کی خوُشی کا راز ہے۔

مشق

1- (i) شکیلہ ناشتہ کیے بغیر سکوُل کیوں چلی گئی؟

(ii) شکیلہ کی سہیلیوں نے اس کا مذاق کیوں اُڑایا؟

(iii) شکیلہ نے سلمٰی کے گھر سے واپس آ کر اس کا ذِکر اپنی امّی سے کن الفاظ میں کیا؟

(iv) شکیلہ کی عادتوں میں کیا تبدیلی واقع ہوُئی؟

2- مندرجہ ذیل الفاظ کو حروفِ تہجّی کے لحاظ سے ترتیب دیجیے، لُغت میں ان کے معنی دیکھیے اور انھیں اپنے جمُلوں میں استعمال کیجیے:-

اُودھم مچانا - مذاق اُڑانا - اُداس ہونا - تندرست - صاف سُتھرا - پُرسکوُن - جھاگ - نصیحت۔

3- مندرجہ ذیل میں سے فعل ماضی، فعل حال اور فعل مستقبل الگ الگ لکھیے:-

شور مچا رہی تھی - کیا کرو گی - بِکھرے ہوُئے تھے - بُرا لگتا ہے - چلتی ہوں - سچ کہتی ہے - خوُش رہتا ہے - مُسکرا رہے تھے - گھر جائیں گے۔

حقُوق اور فرائض

اختر مدرسے سے گھر لوٹنے کے بعد بڑی بے صبری سے اپنے ابّا کا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے جس تقریری مقابلے میں حِصّہ لینا تھا، آج اس کے موضوع کا اعلان ہوگیا تھا۔ اُسے "حقوق اور فرائض" کے عنوان پر تقریر کرنا تھی۔ وُہ اپنے مدرسے کا بہترین مقرّر سمجھا جاتا تھا اور ہر تقریری مقابلے میں ہمیشہ اوّل آتا تھا، لیکن آج وُہ کچُھ پریشان تھا۔ عنوان قدرے مُشکل تھا اور اسے ڈر تھا کہ کہیں اب کے وُہ کِسی سے مات نہ کھا جائے۔ وُہ اپنے ابّا سے رہنمائی چاہتا تھا اِس لیے وہ اُن کی واپسی کا شِدّت سے منتظِر تھا۔ وہ بار بار ڈرائنگ رُوم میں لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھتا۔ اڑھائی بج چُکے تھے۔ عام طور پر اس کے ابّا اس وقت تک گھر پہنچ جاتے تھے، لیکن آج اختر کو جس قدر زیادہ اِنتظار تھا اس کے ابّا کے آنے میں اتنی ہی تاخیر ہو رہی تھی۔ آخر خُدا خُدا کر کے اختر کے ابّا کے سکوُٹر کی آواز آئی اور اختر کی جان میں جان آئی۔ اُس نے دَوڑ کر دروازہ کھولا۔ ابّا جان کو سلام کیا اور کِسی وقفے کے بغیر کہنے لگا۔ "ابّوُ! اتوار کو ہمارا تقریری مقابلہ ہے، مجُھے "حقوق اور فرائض" کے عنوان پر تقریر کرنا ہے۔ سوچ رہا تھا کہ اس موضوع پر کیا کہا جا سکتا ہے؟" اختر کے ابّا یہ سُن کر بولے: "بیٹے اس وقت گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ موضوع بہت واضح اور اہم ہے۔ مَیں کھانا کھا کر تھوڑا سا ستا لُوں، رات کو اطمینان سے بیٹھیں گے اور بات ہو گی۔"

اختر نے جُوں توُں کر کے شام کا وقت گزُارا۔ اِتنے میں رات کا کھانا تیار ہو گیا۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو اختر کے ابّا نے اُسے مخاطب کرتے ہُوئے کہا: "اب کہو بیٹے! تم کیا پُوچھنا چاہتے ہو، وہی حقوق و فرائض کی بات؟ تو سنو! فرائض سے مُراد آپ کی ذمہ داریاں ہیں۔ یعنی وُہ کام جن کا کرنا آپ پر فرض ہے اور جن

کے نہ کرنے سے آپ قصوروار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ اور حقوق سے مُراد وُہ سہُولتیں اور آسائشیں ہیں جن کا حاصل ہونا آپ کا حق ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کے کچھ حقوق ہیں اور کچھ فرائض۔ ان حقوق اور فرائض کا علم ہر شخص کو ہونا چاہیے تاکہ وُہ اپنے فرائض ادا کر سکے اور اپنے حقوق حاصل کر سکے۔ اگر ہم سب کو اپنے اپنے حقوق و فرائض کا پاس ہو تو ہم خُود بھی خُوش رہ سکتے ہیں اور دُوسروں کی زندگی کو بھی خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ دُنیا کی تمام خرابیوں کی اصل وجہ یہی ہے کہ ایک انسان کی حیثیّت سے ہم نہ تو اپنے فرائض ادا کرتے ہیں اور نہ دُوسروں کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔"

اختر اپنے ابّا کی باتیں بڑی توجّہ سے سُن رہا تھا۔ اُس نے پُوچھا: "ابوُّ! یہ تو بتایئے کہ انسان کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا؟" اختر کے ابّا نے جواب دیا: "بیٹے! بات یہ ہے کہ اس دُنیا میں ایک شخص کی ایک حیثیت نہیں ہوتی۔ ہر انسان ایک شہری ہونے کے علاوہ ایک ہی وقت میں بہت سی حیثیتوں کا مالک ہے۔ وہ کسی کا بیٹا ہے اور کسی کا باپ، کسی کا بھائی اور کسی کا دوست۔ ہر حیثیت سے اس کے حقوق اور فرائض جُدا جُدا ہیں۔ تُم اپنی ہی مثال لے لو۔ اِس گھر میں تمُھاری حیثیّت ایک بیٹے کی ہے، مدرسے میں تمھاری حیثیّت ایک طالب علم کی ہے، اس محلّے میں تمُھاری حیثیت ایک پڑوسی کی ہے اور اِس شہر اور مُلک میں تمُھاری حیثیّت ایک شہری کی ہے۔ ایک بیٹے کی حیثیت سے یہ تمُھارا حق ہے کہ تُم اس گھر میں رہو۔ اس گھر کی تمام سہُولتوں سے فائدہ اُٹھاؤ۔ کھانا پینا، علم حاصل کرنا، ماں باپ کی شفقت، بہن بھائیوں کا پیار یہ سب تمھارے حقوق میں شامل ہے اور اگر ہم تُمھیں یہ سب سہُولتیں مہیّا کرتے ہیں تو تُم پر احسان نہیں کرتے اس لیے کہ یہ تمُھارا حق ہے، لیکن ان حقوق کے ساتھ ساتھ ایک بیٹے کی حیثیّت سے تمُھارے کچھ فرائض بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ماں باپ کا کہا مانو۔ بہن بھائیوں کو تنگ نہ کرو، ان کے حقوق نہ چھینو۔ بڑوں کی عزّت کرو اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آؤ، گھر کے کام کاج میں دُوسروں کا ہاتھ بٹاؤ، پڑھنے کے

وقت پڑھو اور کھیلنے کے وقت کھیلو۔ اب ذرا حقوق و فرائض کی اس ترتیب پر غور کرو۔ ایک بیٹے کی حیثیت سے جو تُمھارے حقوق ہیں، وہ میرے اور تُمھاری امّی کے فرائض ہیں اور اور جو تُمھارے فرائض ہیں، وُہ ہمارے حقوق ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم تُمھارے حقوق پُورے کریں اور اسی طرح یہ تُمھارا فرض ہے کہ تُم ہمارے حقوق پُورے کرو۔"

بات واضح ہو چُکی تھی۔ اختر سوچتا جا رہا تھا کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ میرا حق ہے کہ مدرسہ مجھے بہترین تعلیمی سہُولتیں مہیا کرے۔ اُستاد مجھے شفقت سے پڑھائیں۔ کھیل کُود کے مواقع میسّر ہوں، اور یہ میرا فرض ہے کہ مَیں توجّہ سے پڑھوں، مدرسے کے نظم و ضبط کا خیال رکھّوں، اپنے اُستادوں کی عزّت کروں اور ان کا حُکم مانوُں، اپنے ہم جماعتوں اور مدرسے کے ساتھیوں کے ساتھ مِل جُل کر رہوں، بڑوں کی عزّت کروں اور چھوٹوں سے پیار کروں۔

پھر اس کے ذہن میں خیال آیا کہ میں خالد کا پڑوسی بھی تو ہوں۔ ایک پڑوسی کی حیثیّت سے یہ میرا فرض ہے کہ اُسے تنگ نہ کروں، اس سے لڑائی جھگڑا نہ کروں، شور و غوغا سے اس کا سکون برباد نہ کروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی آواز آہستہ رکھّوں، اس کے گھر کے آگے کوڑا کرکٹ نہ پھینکوں، اس کے ماں باپ کی عزّت کروں۔ اگر میں اپنے فرائض اور ہمسائے کے حقوق کا خیال رکھّوں گا تو وُہ یقیناً میرے حقوق کا خیال رکھّے گا، میرے گھریلو معاملات میں دخل نہیں دے گا، مجُھے سُکھ چَین سے رہنے دے گا۔

اختر کے ذہن میں حقوق و فرائض کا مسئلہ واضح ہو گیا تو اُس نے کہا: "ابّا جان! ذرا یہ تو بتا دیجیے کہ ایک شہری کی حیثیّت سے ہمارے کیا حقوق ہیں اور کیا فرائض؟" اختر کے ابّا بولے: "بیٹے! ایک شہری کی حیثیّت سے ہمارا سب سے پہلا فرض تو یہ ہے کہ ہم اپنے مُلک کے قانون کا احترام کریں اور

ان پابندیوں کو خوشی سے قبول کریں جو قانون ہم پر عائد کرتا ہے۔ مثلاً ہر قسم کے ٹیکس ادا کریں، دوسرے شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کریں۔ دوسروں کی آزادی کا لحاظ کریں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں، اپنے وطن سے محبت کریں، جس شہر میں رہیں اس شہر کے قاعدوں کا احترام کریں۔ ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کریں۔ شہر کی صفائی کا خیال رکھیں، دوسرے شہریوں کے حقوق کو پورا کرنے میں مدد دیں۔" یہاں پہنچ کر اختر کے ابا نے ذرا دم لیا تو اختر بولا: "ابو! آپ نے فرائض تو گنوا دیے، ذرا حقوق کی بات بھی تو کیجیے۔" اختر کے ابا نے جواب دیا: "بیٹے! ایک شہری کا سب سے پہلا حق تو اس کی آزادی ہے۔ یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر شخص کو آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حق دے۔ اس کا دوسرا حق اس کے جان و مال اور اس کی عزت کی حفاظت ہے۔ یہ حکومت کا فرض ہے اور دوسرے شہریوں کا بھی کہ اس کی جان، اس کا مال اور اس کی عزت محفوظ رہے۔ ملک اور شہر میں جو سہولتیں بھی مہیا ہیں ان سب سے فائدہ اٹھانا ایک شہری کا حق ہے، مثلاً پانی، بجلی، صفائی، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات اور تعلیم وغیرہ۔ ہر شخص کا یہ بھی حق ہے کہ اسے حلال طریقے سے روزی کمانے کے وسائل مہیا ہوں۔ وہ دنیا میں سکون سے رہ سکے اور کوئی شخص اس کے ذاتی معاملات میں دخل نہ دے۔"

اختر نے یہ سب کچھ سنا تو اس کے ذہن میں کچھ باتیں خود بخود واضح ہو گئیں۔ اگر انسان اپنے فرائض ادا نہ کرے اور محض حقوق پر نگاہ رکھے تو یہ اس کی بہت بڑی بھول ہے۔ ایک اچھا انسان، اچھا شہری، اچھا باپ، اچھا بیٹا، اچھا استاد اور اچھا شاگرد کہلانے کے لیے یہ لازم ہے کہ ہم جہاں اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں، وہاں اپنے فرائض کو بھی یاد رکھیں۔ اگر ہم اپنے فرائض کو صحیح طریقے سے ادا کرنا شروع کر دیں تو ہمیں یقین ہے کہ ہمیں ہمارے حقوق خود بخود ملتے

رہیں گے۔ یہ سوچتے ہوئے اختر اُٹھا اور اپنے کمرے میں جا کر اپنے خیالات کو ایک تقریر کی صورت میں قلم بند کرنے لگا۔

مشق

1- (i) حقوق سے ہم کیا مراد لیتے ہیں ؟
(ii) فرائض سے کیا مُراد ہے ؟
(iii) ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ کے کیا فرائض ہیں ؟
(iv) ایک پڑوسی کی حیثیت سے آپ کے کیا حقوق ہیں ؟
(v) ایک بیٹے کی حیثیت سے آپ کے کیا فرائض ہیں ؟

2- حقوق ۔فرائض ۔ معاملات ۔ وسائل ۔ مواقع ۔ خیالات کے واحد لکھیے۔

3- مات کھانا ۔ جان میں جان آنا ۔ منتظر ۔ ستانا ۔ چوں توں کرکے ۔ دریغ نہ کرنا ۔ نگاہ رکھنا کو جملوں میں اِستعمال کیجیے۔

4- ایک مضمون لکھیے جس میں شہری کے حقوق اور فرائض بیان کیے گئے ہوں۔

دھنک

آج بادل خُوب برسا اور برس کر کھُل گیا
بُوٹا بُوٹا، ڈالی ڈالی، پتّا پتّا دُھل گیا
دیکھنا! کیا دُھل گیا سارے کا سارا آسماں
اُودا اُودا، نیلا نیلا، پیارا پیارا آسماں
ہٹ گیا بادل کا پردہ، مل گئی کرنوں کو راہ
سلطنت پر اپنی پھر خُورشید نے ڈالی نگاہ
دُھوپ میں ہے گھاس پر پانی کے قطروں کی چمک
مات ہے اس وقت موتی اور ہیرے کی دمک
دے رہی ہے لُطف کیا سرسبز پیڑوں کی قطار
اور ہری شاخوں پہ ہے رنگین پھُولوں کی بہار
کیا پرندے پھر رہے ہیں چہچہاتے ہر طرف
راگنی برسات کی خُوش ہو کے گاتے ہر طرف
دیکھنا! وہ کیا اچنبھا ہے، ارے، وہ دیکھنا
آسماں پر، ان درختوں سے پرے، وُہ دیکھنا
یہ کوئی جادُو ہے، یا سچ مُچ ہے اِک رنگیں کماں
واہ وا! کیسا بھلا لگتا ہے یہ پیارا سماں
کس مُصوّر نے بھرے ہیں رنگ ایسے خُوش نُما
اس کا ہر اِک رنگ ہے آنکھوں میں جیسے کھُب گیا

اِک جگہ کیسے اکٹھے کر دیے ہیں سات رنگ!
شوخ ہیں ساتوں کے ساتوں اِک نہیں ہے مات رنگ
ہے یہ قدرت کا نظارا، اور کیا کہیے اسے؟
بس یہی جی چاہتا ہے دیکھتے رہیے اسے
ننّھے ننّھے جمع تھے پانی کے کچھ قطرے وہاں
ان پہ ڈالا عکس سُورج نے، بنا دی یہ کماں
دیکھو دیکھو اب مٹی جاتی ہے وہ پیاری دَھنک
دیکھتے ہی دیکھتے گُم ہوگئی ساری دَھنک
لو ہوا میں مل گئی، وہ سب کی سب کچھ بھی نہیں
آنکھیں مَل مَل کر نہ دیکھو، آؤ، اب کچھ بھی نہیں

(حفیظ جالندھری)

مشق

1- شاعر نے بادل کے کھُل کر برس جانے کے بعد کا جو سماں پیش کیا ہے اُسے اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

2- دَھنک کو رنگین کمان کیوں کہا گیا ہے؟

3- یہ کمان کس طرح بن جاتی ہے؟

4- خالی جگہوں کو پُر کیجیے:-

(i) بادل کا پردہ ہٹ گیا اور کرنوں کو ...... مل گئی۔

(ii) پرندے ہر طرف .... پھر رہے ہیں۔

(iii) دیکھتے ہی دیکھتے ساری .... گُم ہوگئی۔

5- مات ہونا۔ خورشید۔ دمک۔ راگنی۔ اچنبھا۔ آنکھوں میں کھُب جانا۔ عکس کے معنی لکھیے اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

وادیِ کاغان کی سَیر

(حصّۂ اوّل)

گرما کی تعطیلات رابعہ کے لیے بہت سی خُوشیاں لائی تھیں۔ تعطیل سے کچھ ہی دن پہلے وہ امتحان میں کامیاب ہُوئی تھی۔ اب وہ نئی جماعت میں آئی تھی۔ اسے نئی کتابیں ملی تھیں۔ امتحان میں کامیابی کی خُوشی میں امّی اور ابّا نے اس کو تحفے دیے تھے، لیکن اس کے لیے سب سے بڑی خُوشی عالیہ فہمی کا خط لایا تھا۔

عالیہ فہمی ایک مصری لڑکی تھی۔ وہ رابعہ کی قلمی سہیلی تھی۔ اگرچہ رابعہ کی خط کتابت جاپانی، جرمن اور ہسپانوی لڑکیوں سے بھی تھی لیکن اسے سب سے زیادہ خُوشی عالیہ فہمی کا خط پا کر ہوتی تھی، اس لیے کہ اس کا نام بہت مانُوس اور پاکستانی لڑکیوں جیسا تھا۔

عالیہ فہمی نے رابعہ کو لکھا تھا کہ میرے والد پاکستان آرہے ہیں اور مجھے اپنے ساتھ پاکستان لانے پر راضی ہو گئے ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ لے لیا ہے کہ مجھے تمھارے گھر ٹھہرنے کی اجازت دے دیں گے۔

جولائی کے پہلے ہفتہ میں عالیہ فہمی اسلام آباد پہنچ گئی۔ ہوائی اڈے سے رابعہ اس کو اپنے گھر لے آئی۔

اگلے دن رابعہ نے عالیہ کو راولپنڈی اور اسلام آباد کی سیر کرائی۔ عالیہ بہت خُوش تھی۔ اس کو راول بند کی روشنیاں بہت پسند آئیں۔ رات کے کھانے پر ابّا نے ایک اور خوشخبری سُنائی کہ اُنھوں نے عالیہ کو کاغان کی سَیر کرانے کا بندوبست کر لیا ہے۔

رابعہ خُوشی سے اُچھل پڑی اور کہنے لگی: "ابّو کیا سچ مُچ آپ ہمیں کاغان لے چلیں

گے؛ کہیں آپ ہم سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں!"

رابعہ کی امّی بولیں: "لو اور سنو، مذاق کاہے کو کرتے؟ سارا انتظام مکمل ہے۔ بس اب تُم لوگ تیاری کر لو۔ ہم علی الصُبح چل پڑیں گے۔" اس رات کاغان جانے کی خُوشی میں بچّوں کو ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی۔ اگلے دن صبح صبح ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہو گئے تاکہ وہاں پہنچ کر سیاحت کے دفتر سے جیپ حاصل کر سکیں اور ساتھ ہی وہاں سے ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے کا اجازت نامہ بھی لے لیں۔ یہ تمام انتظام مکمّل ہو گئے تو وُہ ایبٹ آباد سے جیپ کے ذریعے کاغان روانہ ہو گئے۔

شوگراں:

جیپ خوبصُورت اور پُرپیچ راستوں پر دوڑ رہی تھی۔ بچّوں کے چہرے خُوشی اور کوہستانی ہَوا کے اثر سے دمک رہے تھے۔ خصوصاً عالیہ فہمی اس سفر کے ہر ہر موڑ سے لُطف اندوز ہو رہی تھی۔

جیپ گڑھی حبیب اللہ سے دریائے کُنہار کے ساتھ ساتھ بالاکوٹ کی طرف بڑھتی گئی۔ عالیہ نے بالاکوٹ کی خصوصیّت کے بارے مین پُوچھا تو رابعہ کے ابّا کہنے لگے: "عالیہ بیٹی! بالاکوٹ ہماری جنگِ آزادی کی تاریخ میں بہت اہم ہے اس لیے کہ یہاں پر ہماری جنگِ آزادی کے ایک دلیر اور بے باک مجاہد سیّد احمد شہید بھی دفن ہیں۔"

وہ لوگ بالاکوٹ سے چوبیس کلومیٹر دُور کوائی کے مقام پر کچُھ دیر ٹھہرے اور وہاں سے جیپ نے بڑی سڑک کو چھوڑ کر ایک پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا تو ابّا نے بتایا کہ اب ہمارا اگلا پڑاؤ شوگراں ہو گا۔ شوگراں کا نام سُن کر عالیہ نے پھر سوال کیا "عموّ جان! شوگراں کتنی بلندی پر ہے؟" رابعہ کے ابّا کہنے لگے: "شوگراں دو ہزار تین سو میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔" اب جیپ شوگراں کی خوبصُورت پہاڑی پر دَوڑ رہی تھی۔ پُورا راستہ چیڑ کے اُونچے اُونچے درختوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ ان درختوں کی سبزی میں نیلاہٹ جھلک رہی

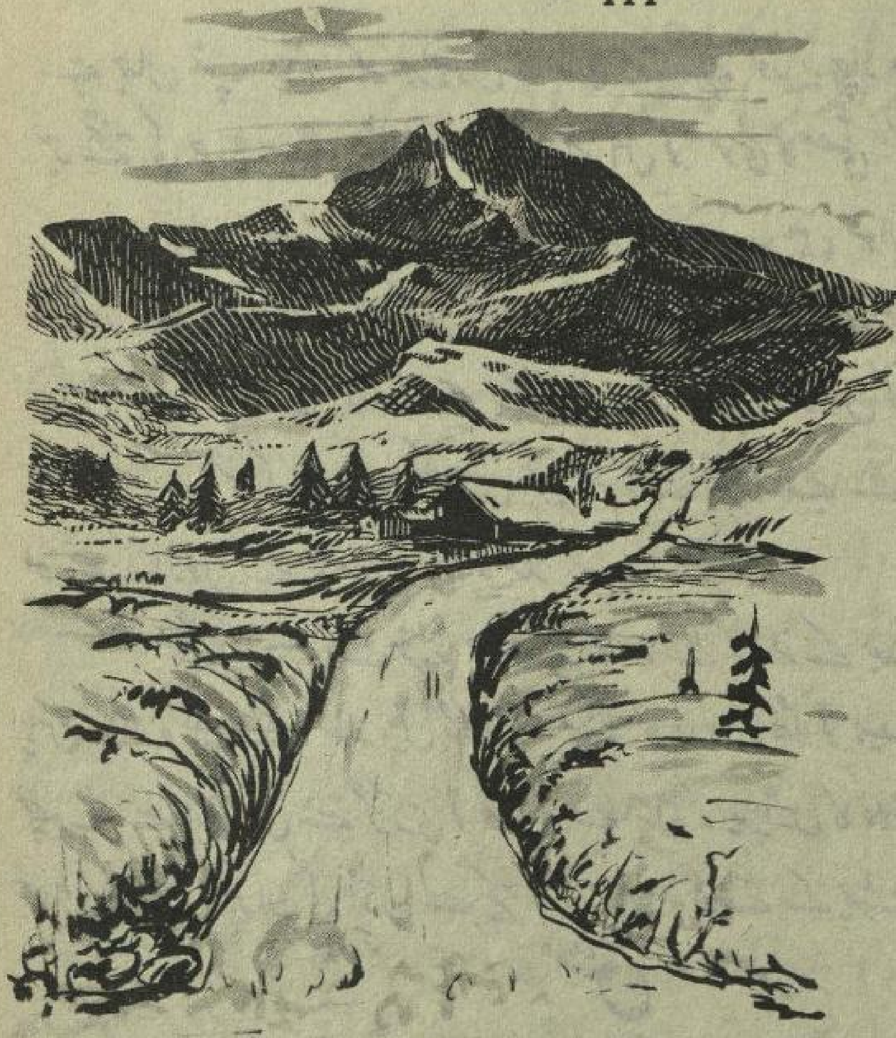
تھی اور ان کی پھننگیں آسمان کو چھوتی نظر آرہی تھیں۔ سفید سفید کھرچیڑ کی ہری بھری شاخوں پر جمی تھی۔ پہاڑیاں نازک اور خوش رنگ جنگلی پھولوں سے بھری تھیں۔ شوگراں پہنچ کر جیپ ایک جھونپڑی نما خوب صورت ریسٹ ہاؤس کے قریب رُک گئی۔



رابعہ کی امّی نے اُترتے ہی کھانے پینے کا انتظام شروع کردیا لیکن ابا بچوّں کے ساتھ باہر ہی ٹہلتے رہے۔ ایک عجیب سی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ عالیہ فہمی نے ایک گہری سی سانس لے کر خوش بو کو محسوس کرنا چاہا تو رابعہ کے ابا نے کہا:

"عالیہ بیٹی یہ سرو کی خوشبو ہے۔"

آبشاروں



کی آواز ایک
نغمے کی طرح
آ رہی تھی۔ رابعہ
نے پُوچھا: "ابُّو!
یہ شور کیسا ہے"؟
ابّا جان نے کہا
"رابعہ یہ تو
آبشاروں کی
آواز ہے"۔ دونوں
لڑکیاں کان لگا کر
بلندی سے گرتے
ہُوئے پانی کی
آواز سُننے لگیں۔
عالیہ چُپ
چاپ ہر چیز کو
غور سے دیکھ رہی
تھی۔ رابعہ نے پُوچھا: "کیا سوچ رہی ہو عالیہ ؟" عالیہ کہنے لگی: میں سوچ رہی ہُوں
کہ مَیں واپس جاؤں گی تو کن لفظوں میں اس منظر کو بیان کر سکوں گی؟"

رابعہ کے ابّا بولے "دیکھو عالیہ! یہ مشرق میں کئی ہزار میٹر کی بلندی پر پہاڑ ہے
اور مغرب میں بالاکوٹ کی وادی ہے اور وہ سامنے ڈاڈر ہے۔ ڈاڈر میں مشہور سینی ٹوریم

ہے جہاں تپ دِق کے مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور یہ چار ہزار دو سو میٹر کی بلندی پر جو تختے کی طرح سیدھی چٹان نظر آرہی ہے اس کو "موسیٰ کا مصلّٰی" کہا جاتا ہے۔"

وہاں سب نے مزیدار کھانا کھایا اور پھر جیپ میں سوار ہو گئے۔ ابّا جان نے ڈرائیور سے پُوچھا: "اب ہم کہاں ٹھہریں گے؟" جیپ ڈرائیور نے جواب دیا: "جناب اب ہم مہانڈری پر رُکیں گے۔ رات وہیں گزارنا ہے۔" جیپ شوگراں کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھی۔ راستے میں جا بجا کسان اپنے کھیتوں میں کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ ان لوگوں کے قد لمبے اور جسم کھلاڑیوں کے جسموں کی مانند چُست تھے۔

شوگراں سے آگے قریباً چھ کلو میٹر کا سفر طے کرنے کے بعد جیپ کو ایک جنگلے کے پاس دروازہ کھُلنے کے انتظار میں رُکنا پڑا۔ جنگلے کا دروازہ کھُلا تو جیپ آگے بڑھی۔ جیپ ایک چھوٹے سے بازار میں سے گزری تو ڈرائیور نے بتایا کہ یہ پارس کا علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگ بھیڑیں پالتے اور ان کی اُون سے کپڑا بُنتے ہیں۔ گائے کے چمڑے سے جُوتے تیّار کرتے ہیں۔

مشق

1- (i) عالیہ فہمی کون تھی اور وہ پاکستان کیوں آئی تھی؟

(ii) شوگراں سطحِ سمندر سے کتنی بلندی پر واقع ہے؟

(iii) کاغان کے سفر میں بالاکوٹ کی کیا اہمیّت ہے؟

2- وادی - تعطیلات - علی الصبح - سیاحت - پُرپیچ - آبشار - نغمہ - مُصلّٰی - کوہستانی کے معنی لُغت میں دیکھ کر یاد کیجیے۔

3- قلمی دوست - خُوش خبری - لُطف اندوز ہونا - شہید کو جملوں میں اِستعمال کیجیے۔

4- ناصر - عالیہ - راولپنڈی - اسلام آباد - مہانڈری خاص نام ہیں - جو الفاظ کسی خاص شخص، خاص جگہ یا خاص چیز کو ظاہر کریں، انھیں اسم معرفہ کہتے ہیں - اس سبق میں سے دس اسم معرفہ تلاش کر کے اپنی کاپی میں تحریر کیجیے۔

وادیِ کاغان کی سَیر

(حصّہ دوم)

مہانڈری :

جیپ پارس کے علاقے سے گزُر کر آگے بڑھی۔ بچّوں کی نگاہیں اُونچے اُونچے درختوں سے ڈھکے راستوں پر جمی ہُوئی تھیں۔ رابعہ نے کہا: "اتّوُ! اب تو شام ہو رہی ہے اور اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ آگے جانا خطرناک تو نہیں ہو گا؟" اُنھوں نے کہا: "ہاں بیٹی! رات ہم مہانڈری میں بسر کریں گے۔" رات مہانڈری کے ریسٹ ہاؤس میں گزُاری اور صُبح صُبح ناشتہ کے بعد روانہ ہُوئے۔ راستے میں مہانڈری کا بازار پڑتا تھا۔ مہانڈری کے لوگ طِلّے کے کام کے جُوتے بہت نفیس تیار کرتے ہیں۔ امّی نے عالیہ فہمی کو طِلّے کے کام کا ایک جُوتا خرید کر دیا۔ ایک طرف سُنار کی دُکان بھی جس پر چاندی اور دُوسری چمکدار دھاتوں کے نہایت نفیس زیور اور بٹن تیار ہو رہے تھے۔ رابعہ نے عالیہ کے لیے خُوبصُورت بٹن خریدے۔ بازار خُوش رنگ اور خُوشِ نُما پھلوں سے بھرا ہُوا تھا اور وہاں کا سیب تو دیکھنے کے لائق تھا۔

جیپ مہانڈری سے چلی تو ابّا جان نے ہنس کر کہا: "بچّو اب تیّار ہو جاؤ۔ اب ہم وادیِ کاغان کے خُوبصُورت ترین راستوں سے گزُریں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تُم آنکھیں مَل مَل کے مجُھ سے پُوچھو کہ آپ کہیں ہم کو دھوکے سے پرستان تو نہیں لے آئے!"

اب جیپ ناراں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کاغان کے سفر میں ناراں کی وہی حیثیّت ہے جو ریل کے سفر میں جنکشن کی ہوتی ہے۔ ناراں میں گاڑیاں اور جیپیں اپنی ٹینکیاں پٹرول سے بھرواتی ہیں۔ کاروباری سواریاں اور قافلے یہاں سے سامان اُتارتے

اور چڑھاتے ہیں۔

رابعہ کی امّی نے کہا: "بچّو! یہاں تم کو ناراں کی خاص مچھلی ٹراؤٹ ملے گی۔چیڑ کی لکڑی پر بھُنی ہوُئی ٹراؤٹ کھاؤ گے تو دُوسری مچھلیوں کا مزہ بھُول جاؤ گے۔"

راستوں کا حُسن اور ناراں کا سکوت اور خاموشی دیکھ کر بچے بڑے سبھی خاموش تھے۔یُوں لگتا تھا کہ بات کریں گے تو یہ سہانا سپنا ٹُوٹ جائے گا۔یہ رات ریسٹ ہاؤس میں گزُارنا تھی۔آتش دان میں صنوبر کی لکڑی جل رہی تھی۔کمرے صنوبر کی مہک میں بسے ہوُئے تھے۔

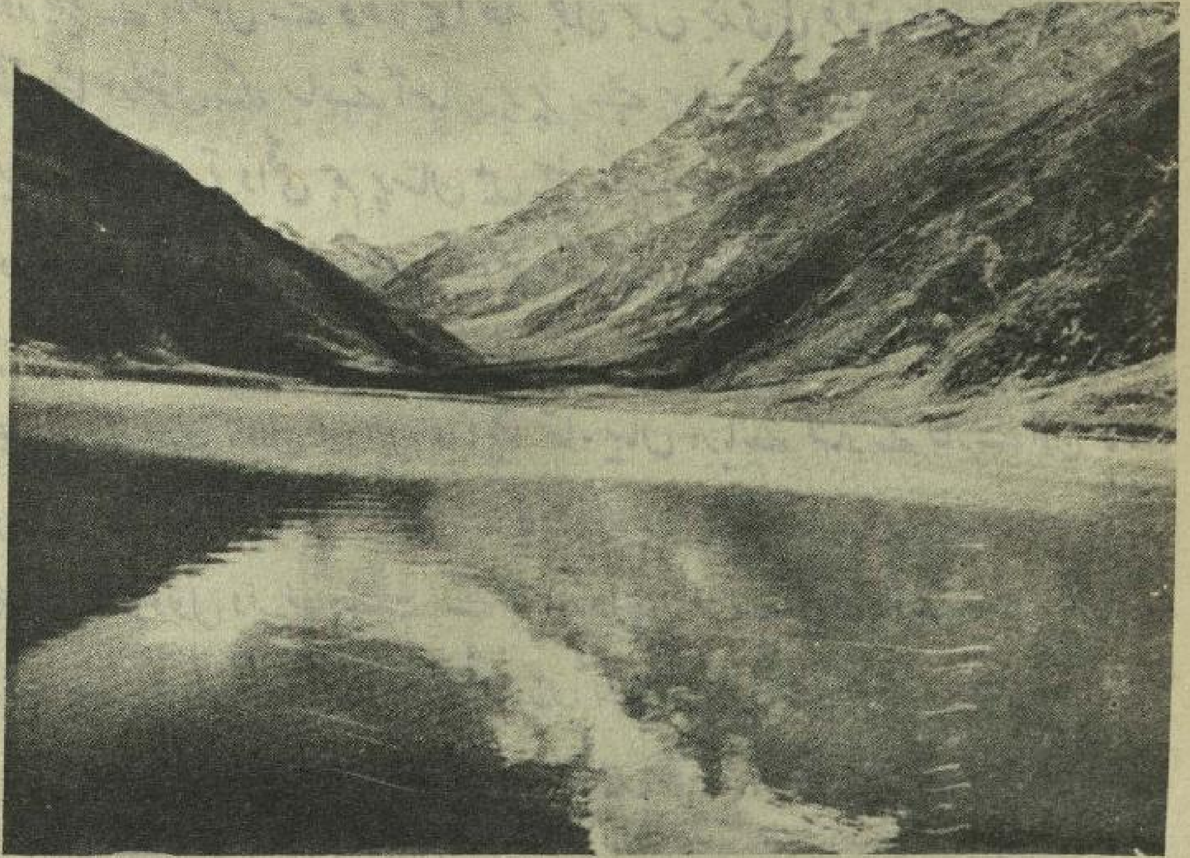
جھیل سیف الملوک:

اگلی صُبح وُہ لوگ مشہور جھیل سیف الملوک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ناراں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ رابعہ نے پُوچھا:"سیف الملوک پر چاندنی راتوں میں پریاں اُترتی ہیں نا؟" ابّا نے ہنس کر کہا:" ہاں رابعہ! اس جھیل کے متعلق ایک کہانی مشہُور ہے، لیکن خیر اب تُم اپنی آنکھوں سے دن کی روشنی میں وُہ پریاں بھی دیکھ لوگی۔" جیپ ایک جگہ جا کر رُک گئی۔ سیف الملوک تک پہنچنے کا راستہ تنگ اور دُشوار گزار ہے۔ سیّاحوں اور مقامی لوگوں کو پیدل یا خچروں اور گھوڑوں پر یہ راستہ طے کرنا ہوتا ہے۔رابعہ کے ابّا نے بھی گھوڑے اور خچّر لے لیے اور سیف الملوک کی جانب روانہ ہوُئے۔سیف الملوک کے راستے میں ایک عجیب بات تھی۔ یہ خِطّہ کچھ کُچھ ریگستان سے مشابہ تھا۔ جگہ جگہ سبز گھاٹیاں مِل رہی تھیں جو خُود رو جنگلی بُوٹیوں اور درختوں سے بھَری ہوُئی تھیں۔

یا اللہ! یہ جھیل ہے کدھر؟ لڑکیاں بے صبر ہو کر پُوچھ رہی تھیں اور خُوبصُورت پھُولوں سے لدے ہوُئے خِطّوں کے درمیان پتھریلے علاقوں اور شگافوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی تھیں جیسے اُنھیں صحرا میں کِسی سراب کی تلاش ہو۔

اچانک ہی عالیہ چِلّا اُٹھی: "وُہ دیکھو! وہ رہی جھیل۔" دونوں لڑکیوں نے سامنے کی طرف دیکھا۔ چاندی کے شفّاف تختے کے مانند ایک چادر سی نظر کے سامنے

پھیلی ہوئی تھی۔ یہ جھیل تھی جس کے کنارے رنگ برنگے پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ جھیل کے کنارے جھکے ہوئے پھولوں کا عکس اس کی سطح پر پڑ رہا تھا اور لگتا



تھا جیسے کسی نے چاندی کی شفّاف چادر میں ہر رنگ کے بے شمار نگینے جڑ دیے ہوں۔ پہاڑوں کی جانب سے خوبصورت اور خوش رنگ پروں والے بے شمار پرندے اُڑتے ہوئے اِدھر سے اُدھر جا رہے تھے۔

رابعہ نے ایک طرف کو اشارہ کیا اور بولی: ”وہ دیکھو پریاں ہی پریاں۔“ سب نے چونک کر دیکھا۔ خوبصورت پروں والی رنگ برنگی کوہستانی تتلیوں کے غول پھولوں کا رس چوستے پھولوں کے ہجوم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہلتے ہوئے خوبصورت پروں کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ اَن گنت پریاں ناچ رہی ہیں۔ وہ لوگ شام کو وہاں سے ناراں واپس آئے۔

اگلی صُبح لالہ زار کے لیے روانہ ہُوئے۔ یہ ناراں سے سترہ اٹھارہ کلومیٹر دُور ہے۔ لالہ زار کی دُھوپ میں اگرچہ حِدّت تھی لیکن ہَوا خُنک تھی۔ سارا جنگل شیکوان، صنوبر اور چیڑ کے درختوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ جُوں جُوں بلندی کی طرف جا رہے تھے، یوں لگتا تھا درختوں کے سائے آسمان پر پڑ رہے ہوں۔ عالیہ ایک دم چِلّا اُٹھی: "اُف میرے اللہ! یہ تو واقعی ہم پرستان میں پہنچ گئے۔" رابعہ نے چونک کر دیکھا۔ کاسنی، جامنی اور ارغوانی پھُولوں پر سفید سفید دُھوئیں کے بادل منڈلا رہے تھے۔ ڈھیروں کی شکل میں پڑے صنوبر کے پھُولوں کی خُوشبُو سے جنگل بسا ہُوا تھا۔ لالہ زار سے کاغان کی طرف جانے کے لیے ناراں کو واپس جانا پڑتا تھا۔ یہاں دریائے کنہار کے کنارے اُون کاتنے کی مِل ہے۔ یہ مِل ایک چھوٹے سے گاؤں جرید میں ہے۔ جرید میں سب سے دِلکش چیز سُرخ پھُولوں والے درخت تھے جو پہاڑوں پر بکثرت اُگے ہُوئے تھے۔ اُن کو دُور سے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ جنگل میں آگ لگی ہوئی ہے۔

عالیہ فہمی نے کاغان کے ڈاک بنگلے میں رکھے ہُوئے سیّاحوں کے رجسٹر میں یہ الفاظ لکھے تھے۔

"مَیں جہاں کہیں بھی رہوں گی اور جہاں بھی جاؤں گی، سیف الملوک اور لالہ زار بھی میرے ساتھ ساتھ ہوں گے۔"

مشق

1- جھیل سیف الملوک کا منظر اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

2- عالیہ فہمی نے کاغان سے واپسی پر اپنے تاثّرات کن الفاظ میں تحریر کیے؟

3- کوہ پیما - دُشوار گزار - گھاٹی - خوُد رَو - دم بخوُد - مناظر - شفّاف - ہجوم - عکس کو حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب وار رکھیے اور ان کے معنی لُغت میں سے دیکھ کر تحریر کیجیے -

4- طے کرنا - گھاٹیاں - پتھریلے - رنگ برنگ - امکان - ملاقاتی - ارغوانی کو اپنے جملوں میں اِستعمال کیجیے -

5- بلندی - خوُبصوُرتی - روشنی - صبح - دُور - کوہستانی کے متضاد الفاظ تحریر کیجیے -

ایک پہاڑ اور گلہری

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

ذرا سی چیز ہے اس پر غرور! کیا کہنا!
یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور! کیا کہنا!

خدا کی شان ہے ناچیز، چیز بن بیٹھیں!
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں

تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں، جانور غریب کہاں!

کہا یہ سن کے گلہری نے منہ سنبھال ذرا!
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انھیں نکال ذرا!

جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا!
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا، کوئی چھوٹا، یہ اس کی حکمت ہے

بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے

قدم اُٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں؟

جو تُو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

(علامہ اقبالؒ)

مشق

1- پہاڑ نے گلہری سے کیا کہا؟

2- گلہری نے اُسے کیا جواب دیا؟

3- اس نظم سے ہمیں کیا سبق حاصل ہوتا ہے؟

4- شرم سے ڈوب مرنا - غرور - بے شعور - ناچیز - بساط - پست - آن بان - منہ سنبھالو - کچّی باتیں - حکمت - چھالیا - نکمّی کے معنی لغت میں سے تلاش کیجیے اور اپنی کاپی میں خوش خط لکھیے، نیز ان سب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

غزوۂ بدر

نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی آمد کے بعد مدینے کی بستی عرب کا ایک اہم مقام بن گئی تھی۔ مُسلمانوں کو مکّے کے کافروں کے ظلم وستم سے نجات مل گئی تو اُنھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مدینے میں اسلام قبُول کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ کفارِ مکّہ کو یہ بات بڑی ناگوار گزُری تھی کہ نبیِ اکرمؐ ان کے ظلم سے بچ کر نکل گئے۔ کفّار کو اسلام کی ترقّی سے بھی چِڑ تھی۔ وُہ چاہتے تھے کہ مُسلمانوں کو مدینے میں بھی چَین سے بیٹھنے نہ دیا جائے تاکہ مدینہ اسلام کا مرکز نہ بن سکے۔

کفّارِ مکّہ کا سردار ابوجہل مُسلمانوں کا جانی دُشمن تھا۔ اُس نے مکّے کے لوگوں کو مُسلمانوں کے ساتھ جنگ پر اُکسایا، نوجوانوں کو غیرت دلائی، تجارتی قافلوں کے لُٹ جانے کا خوف دلایا اور اِس طرح اس نے سب کو مُسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ مکّے کے کفّار جنگ کی تیّاریاں کرنے لگے۔ ہر قبیلے نے اپنا اپنا جنگی دستہ تیّار کر لیا۔ کفّار نے بہت سا زر و مال اکٹھّا کیا۔ تمام بڑے بڑے سردار جنگ پر جانے کے لیے تیّار ہو گئے۔ ابولہب، جو مُسلمانوں سے سخت نفرت کرتا تھا، اُن دِنوں بیمار تھا۔ اس نے ایک اور شخص کو اپنی جگہ جنگ پر آمادہ کیا اور اس کے بدلے میں اس کا قرضہ معاف کر دیا۔

کافروں کی یہ تیّاریاں نہایت خاموشی سے جاری تھیں۔ ایک دن کفّار کی فوج مدینے کو روانہ ہُوئی۔ اِس میں ایک ہزار کے قریب تجربہ کار جنگ جُو شامل تھے۔ ایک سو گھوڑے اور بے شمار اُونٹ جنگی ہتھیاروں اور کھانے پینے کے سامان سے لدے ہُوئے تھے۔ فوج کا ایک ایک سپاہی کیل کانٹے سے لیس تھا۔ راستے

میں جہاں بھی پڑاؤ ہوتا، نو دس دس اُونٹ ذبح کر کے سپاہیوں کی دعوت کی جاتی۔

اُدھر مدینے میں حالت ہی اور تھی۔ مہاجر مسلمان ابھی پُوری طرح آباد نہ ہو سکے تھے۔ سب لوگ تنگی سے گزر کرتے تھے۔ دُشمنوں کا خطرہ ہر وقت لگا رہتا تھا۔ نبی اکرمؐ نے احتیاطی تدابیر کر رکھی تھیں۔ آپؐ خُود جاگ جاگ کر مدینے کی بستی کا پہرا دیا کرتے تھے اور صحابہؓ کے مختلف گروہوں کو اِدھر اُدھر بھیجتے رہتے تھے تاکہ تمام حالات سے باخبر رہیں۔

حضورؐ کو کفّار کی طرف سے اندیشہ پہلے ہی تھا۔ جب آپؐ کو خبر ملی کہ ابوجہل اپنا لاؤ لشکر لے کر مدینہ کی طرف چل نکلا ہے تو آپؐ نے مُسلمانوں کو جمع کر کے جنگ کے بارے میں ان سے مشورہ لیا۔ پہلے آپؐ نے مہاجرین سے رائے لی، اس لیے کہ اس جنگ میں اُن کا مقابلہ اپنے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں سے ہونے والا تھا۔ مہاجر مُسلمانوں نے عرض کیا:

"یا رسُولؐ اللہ! ہم ہر حال آپؐ کا ساتھ دیں گے۔ خُدا کی قسم! ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ اے موسیٰؑ! تُمھارا خُدا اور تم دُشمنوں سے لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔"

پھر آپؐ نے انصار سے مشورہ طلب کیا تو حضرت سعدؓ بن معاذ نے انصار کی ترجمانی کرتے ہُوئے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں۔ ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے اور اس بات کی گواہی دی ہے کہ آپؐ جو تعلیم لائے ہیں، وُہ سچّی ہے۔ ہم آپؐ کی اطاعت اور فرماں برداری کا وعدہ کر چُکے ہیں۔ آپؐ جس طرف ارادہ فرمائیں تشریف لے چلیں، ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ اس خُدا کی قسم جس نے آپؐ کو سچائی دے کر مبعوث کیا ہے، اگر آپؐ ہمیں سمندر میں کُود جانے کا حُکم دیں گے تو ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہیں ہٹے

گا۔ ہم جنگ میں ثابت قدم اور مقابلے میں سچّے ہیں۔ اُمید ہے کہ خدا آپؐ کو ہماری طرف سے ایسے کارنامے دکھلائے گا جس سے آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔"

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے مُسلمانوں کے اس جذبے کی تحسین فرمائی اور یہ طے پایا کہ مدینے سے باہر نکل کر دُشمنوں کا مقابلہ کیا جائے۔

رمضان کا مہینا تھا۔ یہ خدائی لشکر باطل کے طوفان کو روکنے کے لیے شہر سے باہر نکلا۔ خُدا کے آخری رسولؐ اس لشکر کے سالار تھے، جس میں کُل تین سو تیرہ آدمی شامل تھے۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ پُورے لشکر میں کُل دو گھوڑے اور ستّر اُونٹ تھے۔ ایک ایک اُونٹ پر تین تین آدمی باری باری سوار ہوتے تھے حتّٰی کہ نبی اکرمؐ بھی اپنی باری سے اُونٹ پر سوار ہوتے تھے اور دُوسرے ساتھیوں کی باری کے وقت آپؐ بھی پیدل چلتے۔ یہ اسلام کا وُہ لشکر تھا جو حق و باطل کا پہلا معرکہ جیتنے جا رہا تھا، جس کے پاس نہ کھانے پینے کا پُورا سامان تھا، نہ لڑنے کے لیے پُورے ہتھیار تھے۔ لیکن اسلام کے ان مجاہدوں کے پاس سب سے بڑی طاقت ایمان کی طاقت تھی اور وُہ زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر صرف خدا کی رضا کے طالب تھے اور اللہ کی راہ میں جان دینے کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے۔

اسلامی لشکر مدینے سے باہر نکلا تو حضورؐ نے مجاہدوں پر ایک نظر ڈالی۔ دیکھا تو ایک کم سِن لڑکا بھی لشکر کے ساتھ تھا، اس کی عُمر بمشکل سولہ سال تھی۔ حضورؐ نے اس کی کم عُمری کی وجہ سے اس کو واپس جانے کا حُکم دیا۔ لڑکے کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلے۔ آپؐ نے اس کے خلوص اور شوق کو دیکھ کر جہاد کی اجازت دے دی۔ اس بہادر لڑکے نے جنگ میں جوانوں کی سی جرأت دِکھائی اور اسلام کے پہلے شہیدوں میں شامل ہو کر سُرخ روئی حاصل کی۔ اِس کم سِن شہید کا نام عُمیرؓ بن وقاص تھا۔

بدر کے میدان میں اسلام اور کُفر کے لشکروں نے ڈیرے جمائے۔ جنگ میں

ابھی ایک رات باقی تھی۔ دونوں لشکروں کا نقشہ کتنا مختلف تھا! ایک طرف مکّہ کے بڑے بڑے سردار تھے جن کے سروں میں طاقت کا غرور بھرا ہُوا تھا۔ دُوسری طرف خُدا کے وُہ سپاہی تھے جن کا تمام تر بھروسا اللہ کی ذات پر تھا۔ ایمان اور اسلام ہی ان کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ ایک طرف سازو سامان کی کثرت تھی، راگ رنگ کی محفلیں برپا تھیں، اپنے اپنے قبیلے کی برتری اور بہادری کے قصیدے اور رجز پڑھے جارہے تھے۔ دُوسری طرف نہ سازو سامان تھا، نہ شان وشوکت، خُدا کے حضور دُعا و التجا کے سلسلے جاری تھے اور سپہ سالارِ اعظمؐ خُدا کے حضور سربسجُود اسلامی فوج کی کامیابی کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔

اگلی صُبح جنگ شروع ہونے کو تھی۔ حضورؐ اپنے خیمے سے باہر تشریف لائے۔ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے صحابہؓ کی صفیں درست فرمائیں اور جنگ کے لیے اُنھیں ضروری ہدایات دیں۔ آپؐ نے خاص طور پر ہدایت فرمائی کہ جنگ میں پہل نہ کرنا۔ اس کے بعد آپؐ نے خُدا سے دُعا کی اور بلند چبوترے پر تشریف لے گئے جہاں آپؐ کے لیے ایک خیمہ لگا دیا گیا تھا۔ دُوسری طرف کفّار کی فوج مسلح ہوکر مقابل میں کھڑی تھی۔ اُس طرف سے تین نامور پہلوان، جو سر سے پاؤں تک آہنی لباس میں غرق تھے، رجز پڑھتے ہُوئے میدان میں نکلے۔ اِدھر حضورؐ کے حُکم کے مطابق حضرت علیؓ اور اُن کے دو ساتھی مقابلے کے لیے تشریف لائے۔ مقابلہ بڑا سخت تھا لیکن تھوڑی ہی دیر میں وُہ تینوں بڑے پہلوان خاک و خُون میں لت پت پڑے تھے۔

کفّار نے گھبرا کر عام جنگ شروع کر دی۔ دست بدست جنگ میں مسلمان مجاہدوں نے دُشمنوں کی صفیں اُلٹ کر رکھ دیں اور کافروں کے سَر کٹ کٹ کر زمین پر گرنے لگے۔

اِسلامی لشکر کے دو نوجوان مجاہد معوذؓ اور معاذؓ تہیّہ کر کے آئے تھے کہ وُہ اِسلام کے سب سے بڑے دُشمن کا خاتمہ کریں گے۔ جنگ کے ہنگامے کے دوران ہی میں اُنھوں نے ابوجہل کا پتا چلایا۔ دونوں بہادر عقابوں کی طرح ابوجہل پر جھپٹے اور پے در پے حملے کرکے اس کا پُرغرور سَر

خاک میں ملا دیا۔

ان کی جُرأت کا یہ عالم تھا کہ ابوجہل کے بیٹے نے ایک مجاہد کا بازُو تلوار سے کاٹ دیا لیکن ایک تسمہ لگا رہ گیا۔ چونکہ یہ لٹکتا ہُوا بازو جنگ میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا اِس لیے اس بہادر نے خُود ہی اُسے الگ کر کے پھینک دیا اور ایک ہی ہاتھ سے لڑائی جاری رکھی۔

حق و باطل کا یہ معرکہ جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ کفّار کو بُری طرح شکست ہُوئی۔ اُن کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ ستّر سے زیادہ آدمی قید ہُوئے اور باقیوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ اسلامی لشکر کے صِرف چودہ مجاہدوں نے شہادت کا مرتبہ حاصل کیا۔ اِسلام کی اِس پہلی جنگ نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کو اپنے غلبے کے لیے ہتھیاروں کی نہیں، جذبے اور خلوص کی ضرورت ہے۔

مشق

1۔ ان سوالوں کے جواب دیجیے :۔

(i) کافروں کی جنگی تیاری کیسی تھی ؟

(ii) کافروں کے مقابلے میں مُسلمانوں کے پاس کس قدر سازو سامان موجُود تھا ؟

(iii) مہاجرین اور انصار نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کس طرح کیا ؟

(iv) معوذؓ اور معاذؓ نے ابوجہل کو کس طرح قتل کیا ؟

2۔ غزوہ۔ آمادہ کرنا۔ مبعوث کرنا۔ باطل۔ مجاہد۔ کم سن۔ سُرخ رُو ہونا۔ رجز پڑھنا۔ سربسجود ہونا۔ صفیں الٹنا اور خاک میں ملانا کے معنی لکھیے اور انھیں اپنے جُملوں میں استعمال کیجیے۔

3۔ اس سبق میں سے دس اسم معرفہ تلاش کر کے لکھیے۔

4۔ مہاجرین۔ کفّار۔ حالات۔ ہدایات۔ تدابیر۔ مجاہدین کے واحد تحریر کیجیے۔

مچھّر گئے، بیماری گئی

شہر میں خسرے کی وبا کی خبر عام تھی۔ مائیں ہر وقت دعائیں کرتی تھیں: یااللہ! ہمارے بچّوں کو اس مُوذی مرض سے محفوظ رکھیو۔ سرکاری محکمۂ صحت والے گھر گھر جاکر ٹیکے لگا رہے تھے۔ اس دن مسعود کے محلّے کی باری تھی۔ مسعود کے بہن بھائیوں کو ٹیکے لگانے کے بعد ٹیکے والے دُوسروں کے گھروں پر بھی گئے۔ ہر گھر سے ماں یا باپ اپنے بچّوں کو لے کر باہر آتے اور اُن کو ٹیکے لگوا لیتے۔ دیکھتے دیکھتے کتنے بچّوں کو ٹیکے لگ گئے۔ محلے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جنھوں نے اپنے بچّوں کو چھُپا دیا تھا۔

نجّو کی امّاں تو ٹیکے والوں کی آمد کا سُن کر تھر تھر کانپنے لگیں اور نجّو سے کہنے لگیں: "تُو خالہ کے گھر بھاگ جا" اور رشیدہ سے کہا: "تُو چادر اوڑھ کر لیٹ جا۔ میں کہ دوں گی، اس کو بخار ہے۔ بخار میں ٹیکے نہیں لگ سکتے"۔ سب سے زیادہ غضب تو حنیفہ نے ڈھایا۔ اس نے اپنی تینوں لڑکیوں کو اندر بند کر کے گھر کی کُنڈی لگا دی۔

مسعود کی امّی نے سُنا کہ حنیفہ بچیوں کو ٹیکے لگوانے پر راضی نہیں تو وہ اس کو سمجھانے گئیں لیکن وُہ ان پر برس پڑی اور کہنے لگی: "بابا ہمیں معاف کرو۔ ہم نے کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنا دماغ خراب نہیں کیا جو ہم اپنی اولاد کے بازو چھلنی کروائیں ہم کام کاج کرنے والے محنتی لوگ ہیں۔ بچّوں کو ٹیکوں کا بخار چڑھے گا تو سنبھالے گا کون؟" ٹیکے والوں کے علاوہ سب ہی لوگ حنیفہ کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔

تیسرے دن سُننے میں آیا کہ حنیفہ کی تینوں بچیوں کو خسرے کے دانے نکل آئے ہیں۔ ادھر نجّو کی ماں بھی سَر پکڑے رو رہی تھی کہ بیماری کو ہمارے ہی بچّے رہ گئے!

شہر بھر میں جو بیماری پھیلتی، ان دونوں بچّوں کو ضرور پکڑتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے گھر جس احاطے میں تھے وہاں وُہ خود اور محلّے کے دُوسرے لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ اور گلی سڑی چیزیں ایک بڑے سے ڈھیر پر ڈال دیا کرتے تھے۔ احاطے میں نل لگا ہُوا تھا جس سے محلّے کے لوگ پانی بھرتے تھے۔

یہ نل آس پاس کے گھروں کے لیے بھی ایک مصیبت بن گیا تھا۔ عورتیں دن بھر نل کے نیچے کپڑے دھوتیں اور برتن صاف کرتی رہتیں۔ بالٹیاں نل کے نیچے لگا کر بھُول جاتیں۔ پانی کچّے احاطے میں بہتا رہتا۔ اس سے وہاں کیچڑ ہی کیچڑ رہتی۔ حنیفہ کی بچّیاں وہاں کھیلتیں اور کیچڑ میں لت پت ہو جاتیں۔ پھر ایک دن جو حنیفہ کو غصّہ آیا تو اُس نے نل کے ساتھ ساتھ ایک گہری سی نالی بنا ڈالی لیکن پانی کے نکاس کا راستہ ہی نہ رکھا۔

تمام دن کپڑوں کا مَیل اور صابن، برتنوں کی جھُوٹن اور راکھ کا پانی اس میں جمع ہوتا رہتا۔ چند ہی روز میں یہ نالی گندے اور سیاہ پانی کا ایک جوہڑ سا بن گئی جس میں بے شمار مچھّر پیدا ہو گئے۔ سارے محلّے کی نیند حرام ہو گئی۔ گرمی آتی تو اس پر مکھّیاں بھی بھنبھنانے لگتیں۔ مسعود کا گھر بھی اسی احاطے کے سِرے پر تھا۔ اس گندگی سے وہ لوگ سب سے زیادہ تنگ تھے لیکن بول نہیں سکتے تھے۔ ذرا کچھ کہا تو حنیفہ اور نجّو کی اماں ان کے پیچھے پڑ گئیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر سال محلّے میں ملیریا اور انفلوئنزا وبا کی طرح پھیل جاتا تھا۔

مسعود کے ماموں جان نے اسی سال ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا تھا۔ چند دن کی چھٹیاں گزارنے یہاں آئے تو دیکھا، گھر کا گھر ملیریا میں مُبتلا ہے۔ وُہ تو یہ حال دیکھ کر گھبرا گئے۔ مسعود کی امّی نے کہا: "بھئی ہمارے تو پُورے محلّے کا یہی حال ہے۔ ہر برسات میں یہی مصیبت آتی ہے۔" امّی ابھی یہ بات کر ہی رہی تھیں کہ حنیفہ روتی ہُوئی آئی اور کہنے لگی: "میری بڑی بچّی کو بڑا تیز بخار ہے۔ ابھی چند ہی دن ہُوئے کہ خسرے سے نجات پائی تھی،

اب اس ملیریا بخار نے اسے دبا لیا۔" امی نے ماموں جان سے کہا کہ اس کی بچی کو دیکھ کر دوا لکھ دو۔

ماموں جان اُٹھ کر اس کے ساتھ چلے تو مسعود بھی ساتھ ہو لیا۔ حنیفہ کی بچی جامن کے سائے میں ایک چارپائی پر بے سُدھ پڑی تھی۔ ساتھ ہی گندے پانی کی نالی تھی۔ مچھر اور مکھیاں اُڑ اُڑ کر بچی کی ناک میں گھُس رہی تھیں۔ حنیفہ نے پھر رونا شروع کر دیا اور کہنے لگی: "ڈاکٹر صاحب میری بچیوں کو تو بارہ مہینے کوئی نہ کوئی بیماری پکڑے رہتی ہے۔ چار دن کھیلتی ہیں تو چار دن پلنگ پر پڑی رہتی ہیں۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے۔" ماموں جان کہنے لگے: "حنیفہ! بیماری کا گھر تو تم نے خود ہی بنا رکھا ہے۔ ذرا دیکھو تو اتنا غلیظ پانی اور اس میں مکھیوں اور مچھروں کی کثرت! یہ تو ملیریا، ہیضہ اور انفلوئنزا کا گھر بنا ہُوا ہے۔ جب تک اس نالی کو پاٹ کر پکّی نالی نہیں بنے گی اور پانی کا نکاس نہیں ہو گا، ملیریا اور انفلوئنزا تو خیر، یہاں ہیضہ پھیلنے کا خطرہ رہے گا۔"

ڈاکٹر کا نام سن کر نجّو کی اماں بھی آ گئی تھیں۔ دونوں عورتیں کہنے لگیں: "ڈاکٹر صاحب! ہم غریب لوگ بھلا پکّی نالی کیسے بنوائیں اور پھر گندے پانی کا نکاس ہو بھی تو کیسے؟ کون گوارا کرے گا کہ اس کے گھر کے آگے سے گندا پانی بہے۔ بس ہمارے تو نصیب ہی خراب ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا: "بھئی تمہارے نصیب کی خرابی تو یہ لڑکے دُور کر سکتے ہیں۔" ان کا اشارہ مسعود اور اس کے دوست حامد کی طرف تھا جو کالے کالے پانی میں پھُدکتے مینڈکوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ دونوں لڑکے حیرت سے بولے: "ان کے نصیب کی خرابی ہم کیسے دُور کر سکتے ہیں؟" مسعود کے ماموں جان نے کہا: "تم دونوں اندر چلو تو میں بتاؤں کہ کس طرح یہ کام ہو سکتا ہے۔"

بچوں کے لیے نسخے لکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لڑکوں کو لے کر اندر آ گئے اور مسعود سے کہنے لگے: "دیکھو مسعود! یہ کام بڑا آسان ہے، بشرطیکہ تم اور تمہارے دوست کام

کرنے والی ایک جماعت بنالیں اور محلّے کے تمام لوگوں سے چندہ جمع کر کے پکّی نالی بنانے کا سامان مہیّا کرلیں۔" مسعود نے پُوچھا: "مگر ماموں جان! وہ گندہ پانی جائے گا کِدھر؟ نالی سے پانی کا بہنا تو ضروری ہے۔" مسعُود کے سوال پر ماموں بھی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر یکایک ان کی سمجھ میں بات آگئی اور خُوش ہو کر بولے: "بھئی واہ! گندہ پانی تو تمھارے بہت کام آسکتا ہے۔" حامد نے حیرت سے پوچھا: "گندہ پانی کِس کام آئے گا؟" ماموں جان نے کہا: "نَل کے پیچھے جو فالتو زمین میدان کی صُورت میں پڑی ہے، اگر تُم لڑکے ہمّت کر کے اس کو نرم کر ڈالو اور اس میں سبزیوں کے بیج ڈال دو تو یہ پانی سبزیوں کے اس کھیت کے کام آئے گا اور محلّے والوں کے لیے سبزی کا مشترکہ کھیت بھی تیار ہو جائے گا۔ مگر اس کے لیے تُم کو باقاعدہ ایک چھوٹی سی ٹیم بنانا پڑے گی۔"

دیکھتے ہی دیکھتے پانچ بڑے لڑکوں کی ایک مضبُوط جماعت تیّار ہوگئی جو پھاوڑوں اور کدالوں سے لیس تھی۔ ان کی مدد کو محلّے کے کئی چھوٹے لڑکے بھی آگئے۔ سب سے پہلے تو لڑکوں نے گندی نالی کو مٹّی ڈال کر پاٹ دیا۔ درختوں سے جھڑے ہُوئے سُوکھے پتّے کُوڑے کے ڈھیر پر جمع کر کے ان میں آگ لگا دی اور اس طرح وُہ غلاظت کا ڈھیر جل کر بھسم ہو گیا۔

محلّے کے لوگوں نے بچّوں کی مستعدی دیکھ کر نَل کے نیچے کھُرا بنانے اور نالی پکّی کرنے کے لیے ریت سیمنٹ فراہم کر دیا اور اس احاطے میں بکھری ہُوئی ساری فالتو اینٹیں بھی کام آگئیں۔ اس کام میں پُورا ہفتہ لگ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پہلی مرتبہ محلّے کے لوگ چَین کی نیند سوئے، اس لیے کہ مکھّیاں اور مچھّر اب کِسی دُوسرے گندے جوہڑ کی تلاش میں چل دیے تھے۔ ایک سال بعد ڈاکٹر صاحب دوبارہ آئے تو احاطے کی شکل ہی بدل چُکی تھی۔ اب یہاں بُو دار گندے پانی کا کوئی جوہڑ نظر نہ آتا تھا۔ اس کے بدلے نل کے پیچھے سبزیوں کا ایک کھیت لہلہا رہا تھا۔ مسعود سکُول سے آیا تو ماموں جان نے کہا: "مسعود تُم نے اور تمھارے دوستوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ یہ جگہ تو پہچانی ہی نہیں جاتی۔"

مسعود نے کہا: "ماموں جان یہ سب آپ ہی کے مشورے کا نتیجہ ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہم سب دوست چھٹیوں میں بے کار پھر پھر کر اُکتا جاتے تھے اس مرتبہ تو پتا ہی نہ چلا کہ چھٹیاں کب آئیں اور کب گئیں۔" مسعود کی چھوٹی بہن محمودہ بھی اپنی توتلی زبان میں کہنے لگی "اور ماموں جان اب امّی ہم کو ملیریا بخار سے بچنے کے لیے کڑوی کڑوی کونین بھی نہیں کھلاتیں۔"

ماموں جان نے محمودہ کو گود میں لے کر پیار کرتے ہُوئے کہا: "محمودہ بات یہ ہے کہ جب مچھر گئے تو وُہ اپنے ساتھ بیماری بھی لے گئے۔"

مشق

1۔ (i) نجّو اور حنیفہ کی ماں نے اپنی بچّیوں کو کیوں چھُپا دیا تھا؟

(ii) حنیفہ کی بچّیوں کو بیماریاں کیوں لپٹی رہتی تھیں؟

(iii) مسعود اور اس کے ساتھیوں نے گندے پانی کو نکالنے کا کیا انتظام کیا؟

(iv) مچھروں کے چلے جانے سے محلّے والوں کی صحت پر کیا اثر پڑا؟

2۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو حروفِ تہجّی کے لحاظ سے ترتیب دے کر ان کے معنی تحریر کیجیے:۔

وبا۔ موذی۔ انسداد۔ غلیظ۔ مشترکہ۔ مستعدی۔ بے سُدھ۔

3۔ وبا۔ تھر تھر کانپنا۔ غضب ڈھانا۔ احاطہ کرنا۔ کثرت۔ بشرطیکہ۔ فراہم کرنا۔ مسلسل کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

4۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:۔

بیماری۔ محنتی۔ شہر۔ گندہ۔ غریب۔ آسان۔

5۔ اس سبق کے پہلے تین پیروں میں سے اِسم، فعل اور حرف الگ کیجیے۔

محنت کی برکتیں

نہیں کرتے کھیتی میں جو جاں فشانی　　نہ ہَل جوتتے ہیں نہ دیتے ہیں پانی
پہ جب یاس کرتی ہے دِل پر گرانی　　تو کہتے ہیں حق کی ہے نا مہربانی
نہیں لیتے کچھ کام تدبیر سے وُہ
سدا لڑتے رہتے ہیں تقدیر سے وُہ

کبھی کہتے ہیں "زہر ہے مال و دولت　　اُٹھاتے ہیں جس کے لیے رنج و محنت
اسی سے گناہوں کی ہوتی ہے رغبت　　اسی سے دماغوں میں آتی ہے نخوت
یہی حق سے کرتی ہے بندوں کو غافل
ہُوئے ہیں عذاب اس سے قوموں پہ نازِل"

کبھی کہتے ہیں "سعی و کوشش سے حاصل؟　　کہ مقسوم بِن کوششیں سب ہیں باطل
نہیں ہوتی کوشش سے تقدیر زائل　　برابر ہیں یاں محنتی اور کاہل
ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی
تو روٹی نکمّوں کو ہرگز نہ ملتی"

نکمّوں کے ہیں سب یہ دِل کش ترانے　　سُلانے کو، قسمت کے رنگیں فسانے
اسی طرح کے کر کے حیلے بہانے　　نہیں چاہتے دست و بازو ہلانے
وُہ بھُولے ہُوئے ہیں یہ عادت خُدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خُدا کی

مگر اک فریق اور اِن کے سوا ہے شَرَف جس سے نَوعِ بَشَر کو مِلا ہے
سب اس بزم میں جن کا نُور وضیا ہے سب اس باغ میں جن سے نشو ونما ہے
ہُوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر
نہ راحت طلب ہیں نہ مُہلت طلب وُہ لگے رہتے ہیں کام میں روز و شب وُہ
نہیں لیتے دم ایک دم بے سبب وُہ بہت جاگ لیتے ہیں سوتے ہیں تب وُہ
وُہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دُنیا
کماتے ہیں وُہ اور کھاتی ہے دُنیا

(الطاف حسین حالی)

مشق

1- اس نظم میں دو طرح کے انسانوں کا حال بیان کیا گیا ہے، ان کی خصوصیات علیحدہ علیحدہ تحریر کیجیے۔

2- مندرجہ ذیل کے معنی بتایئے :-

یاس۔ نخوت۔ مقسوم۔ باطل۔ سعی و کوشش۔ نوعِ بَشَر۔ ضیا۔ روز و شب۔ زائل۔

3- مندرجہ ذیل کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :-

پانی دینا۔ ہَل جوتنا۔ دل کش۔ خدمت۔ دم لینا۔ روز و شب۔ چین پانا۔ خدمت۔ بے سبب۔

4- مندرجہ ذیل کے ہم قافیہ الفاظ تحریر کیجیے :-

باطل۔ محنت۔ تدبیر۔ ترانے۔

پاکستان کی کہانی

یہ بات بھلا کسے معلوم نہیں کہ پاکستان چودہ اگست 1947ء کو وجود میں آیا۔ اس سے قبل یہ مُلک دُنیا کے نقشے پر تو اس طرح موجُود نہ تھا لیکن گھر گھر میں اس کا چرچا اور شہر شہر میں اس کا شہرہ تھا۔ پاکستان ایک جذبہ تھا، جو ہر دِل میں موجزن تھا۔ ایک پُکار تھی جو ہر زبان پر جاری تھی۔ ایک دھڑکن تھی، جو ہر سینے سے سُنائی دیتی تھی۔ کوئی ایسی تقریر نہ تھی جو اس کے ذِکر سے خالی ہو۔ ہماری نظمیں ہمارے گیت سب پاکستان کے لیے وقف ہو چکے تھے۔ ہر طرف ایک ہی نعرہ تھا: "لے کے رہیں گے پاکستان۔ بن کے رہے گا پاکستان۔" پوری فضا کئی سال تک انھی نعروں سے گونجتی رہی اور آخر اللہ کے فضل سے پاکستان بن گیا۔ لیکن یہ نہ سمجھیے کہ پاکستان صرف نعروں کے زور پر وجود میں آگیا۔ ہمیں درحقیقت پاکستان کے قیام کے لیے بڑی طویل جدوجہد کرنا پڑی۔ انگریز اس کا دُشمن تھا، ہندُو اس کا بیری۔ ان دونوں کا ہم نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور چوں کہ اللہ تعالیٰ کی نصُرت ہمارے ساتھ تھی اس لیے ہمیں کامیابی نصیب ہُوئی اور پاکستان بن گیا۔

پاکستان بننے سے قبل برِّصغیر پر انگریز کی حکومت تھی اور یہاں مسلمانوں کے علاوہ ہندُو اور سِکھ بھی بستے تھے۔ ہندُوؤں کی تعداد مُسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ ہندُو اپنی تعداد کے بَل بوتے پر یہاں حکومت کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ لیکن مُسلمان بھی اس صورتِ حال سے غافل نہ تھے۔ انھیں ہندُو کی تنگ دِلی اور تنگ نظری کا تجربہ پہلے ہی سے تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہندُو ہمیشہ سے اسلام کا دُشمن رہا ہے۔ اگر انھیں یہاں حکومت کا موقع مِل گیا تو مُسلمان آزادی کے ساتھ دینِ اسلام کے مطابق

زندگی بسر نہ کرسکیں گے۔ مُسلمان انگریزوں کی غُلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہندُو کی غلامی میں جکڑے جائیں گے اور مُلک کی آزادی کی جدوجہد سے اُنھیں کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ چنانچہ مُسلمانوں نے سوچا کہ ہمیں آزادی کے مطالبے کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق کی حفاظت بھی کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی الگ سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا اور اس جماعت کا نام مُسلم لیگ رکھّا۔

دسمبر 1930ء میں الہ آباد میں مُسلم لیگ کا سالانہ جلسہ منعقد ہُوا۔ یہ جلسہ اپنے سابقہ جلسوں سے زیادہ اہمیّت رکھتا تھا۔ اس لیے کہ اِس جلسے میں علاّمہ اقبالؒ نے مُسلمانوں کے حقوق کے تحفُّظ کے لیے ایک ایسی تجویز پیش کی جسے آگے چل کر پاکستان کا تصوّر کہا گیا۔ علاّمہ اقبالؒ نے اپنے خطبے میں کہا کہ اِس مُلک کے بعض صُوبے اور علاقے ایسے ہیں جہاں مُسلمانوں کی آبادی ہندُوؤں سے زیادہ ہے۔ مُسلمانوں کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وُہ ان علاقوں میں ایک آزاد اسلامی ریاست قائم کریں جہاں مُسلمان اپنی زندگی اسلامی تمدُّن کے مطابق بسر کرسکیں۔ علاّمہ اقبالؒ کی یہ تجویز ہندُوؤں کو ایک آنکھ نہ بھائی اور انھوں نے اس کی مخالفت شرُوع کردی۔

اُسی سال لندن میں ایک کانفرنس ہُوئی۔ یہ کانفرنس انگریز حکومت نے اِس لیے بُلائی تھی کہ اس میں ہندُوؤں اور مُسلمانوں کی آزادی کے مطالبے پر غور کیا جائے۔ ہندُو رہنماؤں نے انگریزوں کو یہ تاثّر دینا چاہا کہ ہمارے مُلک میں صِرف ایک قوم آباد ہے اور اسی کو حکومت کا حق حاصل ہے، لیکن مُسلمان رہنماؤں نے انگریزوں کو صاف الفاظ میں بتا دیا کہ اِس مُلک میں ایک قوم نہیں بلکہ دو قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندُو اور دُوسری مُسلمان۔ مُسلمانوں کی تہذیب، اُن کا تمدّن، اُن کا مذہب ہندُوؤں سے بالکل جُدا ہے۔ لہٰذا اُن کا آئین بھی الگ ہونا چاہیے اور ہم ایسے کسی دستُور کو نہیں مانیں گے جس میں مُسلمانوں کی جُداگانہ حیثیّت کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔

اسی زمانے میں ہمارے مُلک کا ایک ذہین مُسلمان نوجوان چودھری رحمت علی یہاں سے تعلیم حاصل کرنے انگلستان گیا۔ اس نے انگلستان میں مُسلمان طلبہ کی ایک انجمن بنائی جس میں مُسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کا خاکہ پیش کیا۔ چودھری رحمت علی نے اس اسلامی ریاست کا نام پاکستان تجویز کیا۔ گویا یہ تحریکِ پاکستان کی تمہید تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ مُلک میں آزادی کی تحریکیں زور پکڑتی گئیں۔ ہندو کانگرس اور مُسلم لیگ نے اپنی اپنی مہم تیز کر دی۔ دونوں تحریکوں کا مقصد آزادی کا حصُول تھا لیکن دونوں کی راہیں مختلف تھیں۔ کانگرس یہ چاہتی تھی کہ اقتدار ہندوؤں کے حوالے کر دیا جائے۔ مُسلم لیگ یہ چاہتی تھی کہ انگریز سے آزادی کے بعد مُسلمانوں کے حقوق اس قدر محفُوظ ہو جائیں کہ وُہ اپنے مذہب اور تہذیب کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ چنانچہ قائدِ اعظمؒ اور ان کے رفقا نے سوچا کہ اس کی واحد صُورت یہ ہے کہ مُسلمانوں کو ایسی آزادی حاصل ہو جس میں خُود ان کی حکُومت ہو۔

مارچ 1940ء میں مُسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہُوا۔ اس کانفرنس کے لیے لاہور میں وُہ مقام منتخب کیا گیا جہاں آج مینارِ پاکستان اس مُلک کی بلندی اور عظمت کا اعلان کر رہا ہے۔ مُسلم لیگ کا شاید ہی کوئی بڑا لیڈر ہو جو اس اجلاس میں شرکت سے محروم رہا ہو۔ اس کی صدارت قائدِ اعظمؒ کو کرنا تھی۔ یہ کانفرنس بھی الہ آباد کے جلسے کی طرح بڑی اہمیّت رکھتی تھی۔ اس جلسے میں ایک قرار داد پیش ہونے والی تھی جس کا مقصد اس مُلک میں پاکستان کا قیام تھا۔ اجلاس منعقد ہُوا اور اس کے ہر جلسے میں ہزاروں کا مجمع رہا۔ لاکھوں مُسلمانوں نے بیک آواز یہ فیصلہ کیا کہ برِّصغیر کے شمالی اور مشرقی حِصّوں کو مِلا کر جن میں مُسلمان آبادی کے لحاظ سے اکثریّت میں ہیں، ایک آزاد اور خود مختار اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ اس فیصلے میں اس اسلامی ریاست کے لیے پاکستان کا نام تو نہ لیا گیا لیکن

اس کے کچھ عرصہ بعد ہی یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ اس کا نام پاکستان ہوگا۔

اس قرار داد کے منظور ہوتے ہی مُسلمانوں میں خُوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب انھیں اپنی منزل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ چنانچہ سب نے مل کر اس منزل کو پالینے کا عزم کیا۔ بوڑھوں نے راستہ دکھایا۔ جوانوں نے قدم آگے بڑھایا۔ طلبہ نے جوش اور ولولے کا مظاہرہ کیا۔ پُوری قوم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی۔ پاکستان کے لیے جدوجہد عروج پر پہنچ گئی۔ ہر روز جلسہ، آئے دن جلوس۔ حکومت نے جلسے جلوس پر پابندی لگائی تو مُسلمانوں نے گرفتاریاں پیش کر دیں۔ ہندو پاکستان کی مخالفت پر ڈٹے ہُوئے تھے۔ حکُومت مُسلمانوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہی تھی، لیکن مُسلمان بھی اپنے قول کے سچّے اور دُھن کے پکّے تھے۔ جوں جوں پاکستان کی مخالفت بڑھتی جاتی تھی، مُسلمانوں کا جوش اور جذبہ تیز ہوتا جاتا تھا۔ جب ہندوؤں نے دیکھا کہ مُسلمان پاکستان کے مطالبے پر سختی سے قائم ہیں تو انھوں نے مُسلمانوں کے اس مطالبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور وُہ پاکستان کے قیام پر راضی ہوگئے۔

انگریز حکُومت نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اُس نے بھی اس مطالبے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ آخر 14 اگست 1947ء کو پاکستان ایک آزاد اور خُود مختار اسلامی ریاست کی حیثیت سے وجُود میں آگیا۔ اس کا سبز اور سفید پرچم فضا کی بلندیوں میں لہرانے لگا اور پُورا مُلک پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گُونج اُٹھا۔

پاکستان کو قائم ہُوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے لیکن اس کی جدوجہد کی یادیں آج بھی زندہ ہیں۔ ہم اپنے بزرگوں کی قُربانیاں بھلا کیسے بھُلا سکتے ہیں۔ ہم قائدِ اعظمؒ کے احسانات کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں؟ یہ در اصل انھی کی محنت کا ثمر ہے کہ آج ہم سُکھ چَین سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ انھی کی ہمّت کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں ایک آزاد اسلامی مملکت کا شہری ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ہم ان کے احسان کو ہمیشہ

یاد رکھیں گے اور اس مقصد پر کبھی آنچ نہیں آنے دیں گے، جس کی خاطر ہمارے محبُوب اور عظیم رہنمُا قائدِ اعظم محمدؐ علی جناحؒ نے پاکستان حاصل کیا تھا۔

قائدِ اعظمؒ زندہ باد ۔ پاکستان پائندہ باد

مشق

1- (i) مُسلمانوں نے اپنی الگ سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیوں کیا؟
(ii) علّامہ اقبالؒ نے الہ آباد کے جلسے میں کیا تجویز پیش کی؟
(iii) مُسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور 1940ء کی کیفیّت اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔
(iv) قیامِ پاکستان کے لیے قائدِ اعظمؒ نے جو کوششیں کیں، ان کا مختصر حال بیان کیجیے۔

2- مندرجہ ذیل الفاظ کو حروفِ تہجّی کے لحاظ سے ترتیب دے کر لُغت میں اُن کے معنی تلاش کیجیے:
موج زن ہونا ۔ علامت ۔ طویل ۔ جدوجہد ۔ بیری ۔ نفرت ۔ مفکّر ۔ تمدُّن ۔ آئین ۔ تحفُّظ ۔ نصب العین ۔ عزم ۔

3- چرچا ۔ راگ الاپنا ۔ بَل بوتے پر ۔ سختیاں جھیلنا ۔ مقصد ۔ نصب العین ۔ جدوجہد کو اپنے جُملوں میں استعمال کیجیے۔

4- اس سبق میں سے دس فعل مستقبل تلاش کر کے لکھیے۔

نیک دِل شہزادہ



مُدّتوں پُرانی بات ہے، شہر سے دُور ایک ٹیلے پر ایک مُجسّمہ تھا جس کے جسم پر سونے کے پَر لگے ہُوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں قیمتی ہیرے جڑے ہُوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی جس کا دستہ یاقُوت کا بنا ہُوا تھا۔

سردیوں کا موسم شرُوع ہو چُکا تھا۔ شام ہونے کو تھی۔ ایک ننّھی چِڑیا کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھی۔ وُہ اپنے ساتھیوں سے بِچھڑ گئی تھی۔ اُس نے مجسّمے کو دیکھا اور اس کے قدموں میں دبک کر بیٹھ گئی۔ رات گہری ہُوئی تو تھکی ماندی چڑیا سو گئی۔

اچانک چِڑیا کے جسم پر پانی کا ایک قطرہ گرا۔ ٹپ۔ چِڑیا چونک اُٹھی۔ اِتنے میں ایک اور قطرہ گرا۔ پھر ایک اور۔ ایک اور۔ ٹپ ٹپ ٹپ۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ وُہ بہت حیران ہُوئی۔ ذرا غور کیا تو کیا دیکھتی ہے کہ مُجسّمے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ

آنسو گر رہے ہیں۔

چڑیا اُڑ کر مجسّمے کے کندھے پر جا بیٹھی اور اُس سے پُوچھنے لگی:

"تم کون ہو اور اس طرح رو کیوں رہے ہو؟"

مجسّمہ بولا: "میرا نام شاہزادہ نیک دِل ہے۔ مَیں جب تک زندہ رہا، اِنسانوں کی خدمت کرتا رہا۔ میرے مرنے کے بعد لوگوں نے میرا مجسّمہ بنا دیا اور اس پر سونے کے پَر اور ہیرے جَڑ دِیے اور اس اُونچی جگہ پر نصب کر دیا۔ یہاں سے مَیں چاروں طرف آسانی سے دیکھ سکتا ہُوں۔ مَیں دیکھتا ہُوں کہ لوگ مصیبت میں مُبتلا ہیں، لیکن مَیں اُن کی مدد نہیں کر سکتا۔ لوگوں کی مصیبت اور اپنی بے بسی پر میرا دِل کُڑھتا ہے، اس لیے رات بھر آنسو بہاتا رہتا ہُوں۔ وُہ دیکھو! سامنے ایک گھر میں ایک غریب عورت بیٹھی ہے۔ پاس ہی اس کا بچّہ بُھوک سے بِلک رہا ہے۔ آج اس عورت کو کہیں سے بھی کوئی کام نہیں مِلا۔ اِس کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ بچّے کے لیے دُودھ یا غذا لا سکے۔ کاش! مَیں اس کی مدد کر سکتا۔ میرے بس میں ہو تو مَیں اپنی تلوار کا یاقُوت اس غریب عورت کو دے دوں تاکہ وہ اسے بیچ کر کھانے پینے کا سامان لا سکے۔ کاش!"

چِڑیا بولی: "نیک دِل شہزادے! غم نہ کر! مَیں اگرچہ تھکی ماندی ہُوں اور کل مُجھے ایک لمبا سفر بھی کرنا ہے لیکن مَیں اس کام میں ضرُور تُمھاری مدد کروں گی۔ لاؤ مُجھے دو یاقُوت۔ مَیں ابھی جاتی ہوں۔" چِڑیا اُڑی اور چُپکے سے جا کر یاقُوت اس غریب عورت کے پاس رکھ آئی۔

صُبح ہُوئی تو چِڑیا نے کہا: "اے نیک دِل! خُدا حافظ۔ اب مَیں اپنے وطن جاتی ہُوں۔"

شہزادہ بولا: "پیاری چِڑیا! ایک رات اور ٹھہر جا۔ وہ دیکھ! ایک غریب بُوڑھا بیمار ہے۔ بے چارے کے پاس کھانے کو ہے نہ پہننے کو۔ دوا کا بھی کوئی

انتظام نہیں۔ آج رات میری ایک آنکھ کا ہیرا اس بُوڑھے کو دے آنا۔"

چڑیا نے یہ بات مان لی۔ رات ہُوئی تو وُہ مجسّمے کی ایک آنکھ کا ہیرا غریب بُوڑھے کے ہاں رکھ آئی۔ اگلی صُبح چڑیا نے وطن جانے کی تیاری شرُوع کی۔ شہزادے نے اس سے کہا: "بس ایک رات اور ٹھہر جا۔ وُہ دیکھ! ایک یتیم بچّی پھٹے پرُانے کپڑوں میں لپٹی بیٹھی ہے۔ اس سخت سَردی کے موسم میں اس کے پاس نہ گرم کپڑے ہیں، نہ آگ جلانے کا کوئی سامان ہے۔ آج رات میری دُوسری آنکھ کا ہیرا اس بچّی کو دے آنا۔"

چڑیا بولی: "پیارے شہزادے! جب دونوں آنکھوں کے ہیرے دے دوگے تو تُمھیں کچُھ نظر نہیں آئے گا۔"

شہزادہ بولا: "کوئی حرج نہیں۔ ایک انسان کی زندگی میری آنکھوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ اگر میں اپنی آنکھیں قُربان کر کے ایک انسان کی جان بچا سکوں تو مجھے دِلی خوُشی ہو گی۔"

اُس رات چڑیا نے دُوسری آنکھ کا ہیرا نکالا اور یتیم بچّی کے گھر رکھ آئی۔

صُبح ہوئی تو شہزادے نے کہا: "پیاری چڑیا! جاؤ خدا حافظ! اپنے وطن کو سدھارو۔"

چڑیا بولی: "نہیں اب مَیں اپنے وطن نہیں جاؤں گی۔ مجُھے سردیوں کا خوف بھی نہیں۔ تم نے خدمت کرنا سِکھا دیا ہے۔ تُم نے مصیبت زدوں کی مدد کے لیے اپنی آنکھیں تک قُربان کر دیں۔ اب میں تُمھارے پاس رہوں گی۔ دن بھر شہروں میں پھروں گی اور تُمھیں لوگوں کے حالات بتایا کروں گی۔"

ننھّی چڑیا دن بھر شہروں کا چکّر لگاتی اور رات کو مجسّمے کے پاس آ جاتی۔ وُہ اُسے اُن لوگوں کے حالات سُناتی جو کسی مصیبت میں مُبتلا ہوتے تھے۔ نیک دِل شہزادہ ہر رات اپنے جِسم سے سونے کا ایک پَر الگ کر کے چڑیا کو دیتا اور وُہ کسی غریب محتاج کو دے آتی۔ اسی طرح سَردیوں کے دن گزُر گئے۔ بہار کا موسم آگیا۔ لوگ اِدھر اُدھر

سَیر کو نکلنے لگے۔ ایک دن چند آدمی ٹیلے پر آئے۔ اُن میں سے ایک آدمی نے دیکھا کہ مجسّمے کے قدموں میں ایک چڑیا مری پڑی ہے۔ ذرا غور کیا تو نظر آیا کہ مجسّمے کے جسم سے سونے کے پَر اُتر چکے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے ہیرے بھی غائب ہیں اور تلوار کا دستہ بھی غائب ہے۔ اب اُنھیں پتا چلا کہ ان سردیوں میں غریب لوگوں کی مدد کون کرتا رہا ہے۔

اس شہر کے لوگ نیک شہزادے کے مجسّمے اور مہربان چڑیا کی کہانی آج تک اپنے بچّوں کو سُناتے ہیں۔

(ماخوذ)

مشق

1- مجسّمہ کِسے کہتے ہیں؟

2- نیک دِل شہزادے نے چڑیا کو گھر جانے سے کیوں روکا؟

3- بعد میں چڑیا نے اپنے وطن جانے سے کیوں اِنکار کر دیا؟

4- اس کہانی سے ہمیں کیا سبق مِلتا ہے؟

5- پناہ گاہ۔ نام ونشان۔ نصب کرنا۔ مُبتلا ہونا۔ بے بسی۔ دِل کُڑھنا کے معنی یاد کیجیے۔

6- جُملے بنا کر سمجھائیے کہ یہ الفاظ کن موقعوں پر بولے جاتے ہیں:-

جناب۔ خُدا حافظ۔ خُوش آمدید۔ تشریف رکھیے۔ جی نہیں۔ معاف کیجیے۔ شُکریہ۔

رات

گیا دن، ہُوئی شام، آئی ہے رات
خُدا نے عجب شے بنائی ہے رات
نہ ہو رات تو دن کی پہچان کیا
اُٹھائے مزہ دن کا اِنسان کیا
ہُوئی رات، خلقت چُھٹی کام سے
خموشی سی چھائی سرِ شام سے
مُسافر نے دن بھر کیا ہے سفر
سرِ شام منزل پہ کھولی کمر
درختوں کے پتّے بھی چُپ ہو گئے
ہَوا تھم گئی، پیڑ بھی سو گئے
اندھیرا اُجالے پہ غالب ہُوا
ہر اِک شخص راحت کا طالب ہُوا
ہُوئے روشن آبادیوں میں چراغ
ہُوا سب کو محنت سے حاصل فَراغ
کِسان اب چلا کھیت کو چھوڑ کر
کہ گھر میں کرے چَین سے شب بَسر
تھپک کر سُلایا اسے نیند نے
تردُّد بُھلایا اسے نیند نے

غریب آدمی جو کہ مزدور ہیں
مشقّت سے جن کے بدن چور ہیں
وہ دن بھر کی محنت کے مارے ہوئے
وہ ماندے، تھکے اور ہارے ہوئے
نہایت خوشی سے گئے اپنے گھر
ہوئے بال بچّے بھی خوش دیکھ کر
گئے بھول سب کام دھندے کا غم
سویرے کو اُٹھّیں گے اب تازہ دم
کہاں چین یہ بادشہ کو نصیب
کہ جس بے غمی سے ہیں سوتے غریب

(اسمٰعیل میرٹھی)

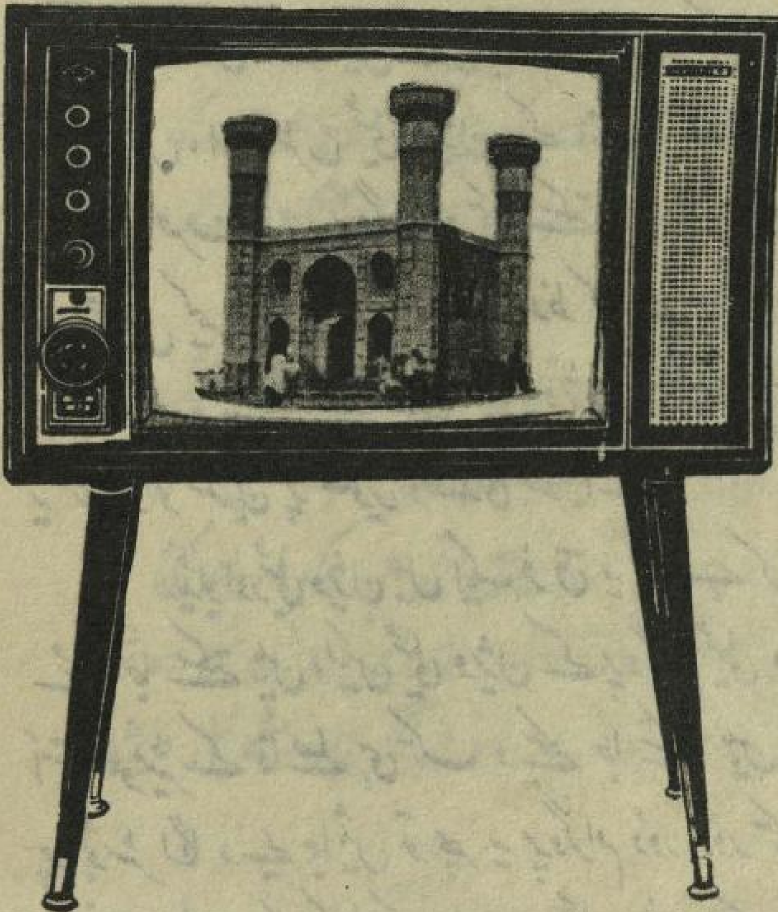
مشق

1- رات نہ ہوتی تو ہمیں کیا تکلیف ہوتی؟
2- کون کون سے کام رات کو بند ہو جاتے ہیں؟
3- رات کا سماں اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔
4- سرِ شام - منزل - راحت - طالب - فراغ - تردُّد - تازہ دم کے معنی یاد کیجیے۔
5- شعروں کی نثر بنانا سیکھیے۔ مثلاً پہلے شعر کی نثر یہ ہے:۔

دِن گیا شام ہوئی رات آئی ہے، خُدا نے رات عجب شے بنائی ہے۔
اِسی طرح مختلف شعروں کی نثر بنا کر مشق کیجیے۔

ٹیلی ویژن

یوں تو سائنس کی بہت سی ایجادات قابلِ ذکر ہیں، مثلاً بجلی، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ، لیکن ایک ایجاد ایسی ہے جو عُمر میں ان سب سے چھوٹی مگر مقبولیت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اس کا گھر گھر چرچا ہے۔ کیا بچّے، کیا جوان اور بُوڑھے، سبھی اس کے دِل دادہ ہیں۔ شہری ہو یا دیہاتی، امیر ہو یا غریب، ہر شخص کو اس کا شوق اور ہر آدمی کو اس کی خواہش ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو سَر اُٹھا کر کسی شہر کے مکانات کی چھتوں اور منڈیروں کی طرف دیکھیے یا کسی اُونچے مینار پر چڑھ کر نیچے شہر پہ نظر دوڑائیے تو آپ کو بے شمار گھروں کی چھتوں پر ایک لمبا بانس نظر آئے گا۔ اس پر پتلی پتلی سلاخوں کا ایک جنگلا سا لگا ہُوا ہو گا۔ بالکل ایسے جیسے کبُوتروں کی چھتری ہو۔ لیکن نہیں! یہ کبُوتروں کی چھتری نہیں ہے، یہ تو ٹیلی ویژن کا انٹینا ہے۔



ٹیلی ویژن کے انٹینا کو غور سے دیکھیے تو اس کے ساتھ ایک تار لٹکا ہُوا نظر آئے گا۔ اس تار کا ایک سِرا انٹینے سے

بندھا ہے اور دُوسرا ٹیلی ویژن میں لگا ہے۔ ٹیلی ویژن کو جادُو کا ایک چھوٹا سا صندُوق سمجھ لیجیے جس کے ایک طرف شیشے کی سکرین لگی ہُوئی ہے۔ جب ٹیلی ویژن چل رہا ہو تو اِس سکرین پر بدل بدل کر تصویریں یوں نظر آتی ہیں جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ اس سکرین کے پیچھے چھوٹے چھوٹے پُرزوں کا ایک جال سا بچھا ہوتا ہے۔ دراصل یہ ایک نہایت پیچیدہ مشین ہے، جو اس صندوق میں تصویر اور آواز کا ایسا جادُو جگاتی ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ٹیلی ویژن ریڈیو کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دونوں ایک ہی اصُول پر کام کرتے ہیں۔ فرق صِرف اتنا ہے کہ ریڈیو کے ذریعے ہم فَقَط آواز ہی سُنتے ہیں لیکن ٹیلی ویژن پر آواز کے ساتھ بولنے والے کی تصویر بھی دیکھتے ہیں اور ہمیں یوں محسُوس ہوتا ہے کہ بات کرنے والا خُود ہماری محفل میں بیٹھا ہُوا ہے۔ جس طرح ریڈیو کے اپنے اندر کوئی آواز نہیں ہوتی بلکہ آوازیں ہوا کی لہروں کے ذریعے ریڈیو تک پہنچتی ہیں، اسی طرح ٹیلی ویژن کے اندر نہ آواز ہوتی ہے نہ تصویر۔ اور ہم ٹیلی ویژن سے بھی صرف وہی پروگرام دیکھ سکتے ہیں جو ٹیلی ویژن سٹیشن سے نشر ہوتے ہیں اور جنھیں کیمرہ اور مائیکروفون محفوظ کر کے ہوا کی لہروں کے ذریعے ٹیلی ویژن سیٹ تک پہنچا دیتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کا انٹینا اس عمل میں بہت مدد دیتا ہے۔ یہ نہ ہو تو سکرین پر تصویر دھندلی نظر آئے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ریڈیو کے پروگرام دُور دُور تک سُنے جا سکتے ہیں، لیکن ٹیلی ویژن کے پروگرام ٹیلی ویژن سٹیشن سے صِرف سترّ یا اَسّی کلومیٹر کے فاصلے ہی تک دیکھے جا سکتے ہیں، البتہ اگر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بُوسٹر لگا دیے جائیں تو پھر یہ پروگرام دُور دُور تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ اب تو سائنس نے اور بھی کمال کر دیا ہے۔ ٹیلی ویژن کے پروگرام اگر خلائی سیّاروں کی مدد سے

نشر کیے جائیں تو ان کو ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ٹیلی ویژن بھی خُوب چیز ہے۔ اس سے تفریح بھی ہوتی ہے اور تعلیم بھی۔ اسے سبھی دیکھ سکتے ہیں اور پھر لُطف یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی اپنی پسند کا کوئی نہ کوئی پروگرام دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ کہانی، ڈراما، گانا، ترانہ، کارٹون، خبریں، تقریریں، مذاکرے، مباحثے یہاں سبھی کچھ حاضر ہے۔ لیکن ٹیلی ویژن تفریح سے زیادہ تعلیم کا فرض ادا کرتا ہے۔ سچ پُوچھیے تو ٹیلی ویژن کا ایک بہت بڑا مقصد ہی یہ ہے۔ اس سے صرف بچّوں اور طالب علموں ہی کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ پُوری قوم کے ہر فرد کی تعلیم ہو سکتی ہے۔ ٹیلی ویژن کے ذریعے لوگوں کو ان کی خامیوں اور کمزوریوں سے باخبر کر کے ان کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ ٹیلی ویژن کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ ہماری معلومات وسیع ہوتی ہیں۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں کی تصویری رپورٹیں ملتی ہیں۔ بلکہ دُنیا کی خبریں اپنے اصل روپ میں ہم تک پہنچتی ہیں۔ ٹیلی ویژن نے فاصلے کا احساس کم کر دیا ہے۔ نیویارک میں اقوام متحدہ کے جلسے کی رپورٹ ہو یا کھیلوں کے عالمی مقابلے، ہم گھر بیٹھے یوں دیکھ لیتے ہیں جیسے یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔

ٹیلی ویژن سے باقاعدہ تعلیم کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ خُود ہمارے مُلک میں ٹیلی ویژن پر سائنس کے سبق ہوتے رہتے ہیں۔ تعلیمِ بالغاں ہوتی ہے۔ عربی سکھانے کے لیے بھی ٹیلی ویژن کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اس کے ذریعے کئی اور مضامین کی تعلیم بھی دے سکتے ہیں۔ بعض بیرونی ممالک میں تو ٹیلی ویژن صُبح سے شام تک تعلیم کے لیے استعمال ہوتا ہے اور طالب علم مدرسے اور گھر میں بیٹھے ٹیلی ویژن کے ذریعے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

ہمارے مُلک میں بعض لوگ ٹیلی ویژن کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں

ٹیلی ویژن ہمارے وقت اور کام کا دُشمن ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھنے سے طالب علموں کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ لوگ سُست اور کاہل ہو جاتے ہیں اور اپنا کام کاج چھوڑ کر ہر وقت ٹیلی ویژن کے گرد حلقہ جمائے بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن غور کریں تو اس میں ٹیلی ویژن کا کیا قصور؟ کون کہتا ہے کہ ہم اپنے تمام کام چھوڑ کر ٹیلی ویژن دیکھا کریں! ٹیلی ویژن یا تو اس وقت دیکھنا چاہیے جب ہمیں فُرصت ہو یا اس وقت جب کوئی اہم پروگرام ہو رہا ہو۔ ٹیلی ویژن درحقیقت دُوسری سائنسی ایجادات کی طرح ایک اہم اور مُفید ایجاد ہے۔ اس کے فائدے بھی ہیں اور نُقصان بھی۔ اگر ہم اس سے اچھّا اور مُفید کام لیں گے اور اس پر اعلیٰ درجے کے تعلیمی، معلوماتی اور تفریحی پروگرام نشر کریں گے تو اس ایجاد سے قوم کا کردار بُلند ہو گا۔ اگر ہم گھٹیا اور پست درجے کے پروگرام نشر کریں گے تو اس سے قوم کا اخلاق بگڑے گا۔

بچّوں کو ٹیلی ویژن دیکھنے میں ذرا زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔ انھیں تعلیمی پروگرام تو ضُرور دیکھنے چاہییں لیکن باقی پروگرام اس وقت تک نہیں دیکھنے چاہییں جب تک مدرسے کا کام ختم نہ ہو جائے۔ بچّوں کو چاہیے کہ وہ ایسے پروگرام ضُرور دیکھیں جو اُن کے لیے نشر کیے جاتے ہیں، خواہ وہ تعلیمی پروگرام ہوں یا تفریحی۔ اُنھیں یہ بھی چاہیے کہ وہ ٹیلی ویژن سے ذرا فاصلے پر بیٹھ کر دیکھیں۔ ٹیلی ویژن کی سکرین کے قریب بیٹھنے سے نظر خراب ہو جاتی ہے۔ کمرے میں اندھیرا کر کے ٹیلی ویژن دیکھنے سے بھی نظر پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

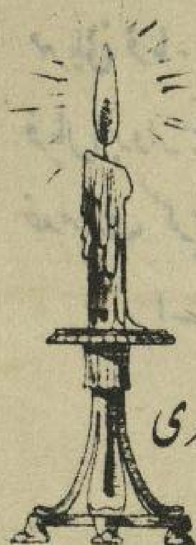
مشق

1- ٹیلی ویژن سے کون کون سے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں؟

2- ٹیلی ویژن کے غلط استعمال سے کیا کیا نقصان ہوتے ہیں؟

3- جادُو جگانا۔ دنگ رہ جانا۔ حلقہ جمانا۔ قابلِ ذکر۔ اخلاق۔ ایجادات۔ مضامین۔ معلومات۔ پیچیدہ۔ تفریح کو تہجّی ترتیب سے لکھیے، ان کے معنی یاد کیجیے۔

4- تصویر بنا کر رنگ بھریئے، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، ریڈیو۔ 5- اس سبق میں سے ضمیریں تلاش کیجیے۔



دُعا

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صُورت ہو خُدایا میری

دُور دُنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھُول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صُورت یا رَب
عِلم کی شمع سے ہو مجھ کو محبّت یا رب

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دَرد مندوں سے ضعیفوں سے محبّت کرنا

مرے اللہ ! بُرائی سے بچانا مُجھ کو
نیک جو راہ ہو، اس رَہ پہ چلانا مُجھ کو

(علاّمہ اقبالؒ)

سب بچّے مِل کر دُعا مانگیں اور اللہ کا شُکر ادا کریں جس نے انھیں طرح طرح کی نعمتیں عطا فرمائیں۔

"اے ہمارے مالک ! ہم تیرا شُکر ادا کرتے ہیں کہ تیری دِی ہُوئی توفیق

سے ہم نے پڑھنا لکھنا سیکھا - آج ہم نے اپنی یہ کتاب ختم کرلی ہے - تُو ہم پر مہربانی فرما - ہمیں نیک کام کرنے کی ہمّت دے - ہم اپنے والدین اور اُستادوں کے فرماں بردار بنیں - دل لگا کر علم حاصل کریں اور پڑھ لکھ کر اپنے وطن کی خدمت کریں -

اے اللہ! ہمیں اچھّا مُسلمان اور بہادر پاکستانی بنا - آمین۔"



نظر ثانی شدہ و منظور کردہ قومی ریویو کمیٹی وفاقی وزارتِ تعلیم و صوبائی رابطہ (شعبۂ نصاب) حکومتِ پاکستان، اسلام آباد۔
قومی کمیٹی برائے جائزہ کتبِ نصاب کی تصحیح شدہ۔

قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد
پاک سرزمین کا نظام قوّتِ اُخوّتِ عوام
قوم، مُلک، سلطنت پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد
پرچمِ ستارہ و ہلال رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی، شانِ حال جانِ استقبال
سایۂ خُدائے ذُوالجلال

کوڈ نمبر G-52 2359 سیریل نمبر

تاریخ اشاعت	اشاعت	بار	تعداد اشاعت	قیمت
مئی 1983ء	اوّل	چہارم	5,000	6.00